

GES 128 BARF KE PHOOL (SHORT STORIES)
BY HUSNA SARWAR 40.00 1989

برف کے پھول

(افسانے)

حسنی سرور



موڈرن پبلشنگ ہاؤس

۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

۹۵۰ ب زائد ساتواں کراس
شیواجی روڈ۔ این۔ آر محلہ میسور
۵۷۰۰۰۷

اشاعت : ـــــــ ۱۹۸۹ء
قیمت : ـــــــ چالیس روپے
کتابت : ـــــــ راحت علی خاں
طباعت : ـــــــ اے ون آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی ۶
سرورق : ـــــــ رزاق ارشد



زیر اہتمام:
پریم گوپال متل

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

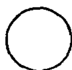
عزیز قارئین کے نام

جو میرے ادبی سفر ______
کے آغاز ہی سے میری پذیرائی
کرتے رہے ہیں

اور ______

اِن افسانوں کے اُن جیتے جاگتے کرداروں
کے نام بھی
جو معاشرے اور ماحول کے پردوں سے
جھانک جھانک کر مجھے مجبور کرتے ہیں کہ

ہمیں لکھو! ______



فہرست



فہرست





حُسنیٰ سَرور

ولادت : ــــ جون ۱۹۳۹ء

وَطن : ــــ ہاسن۔ کرناٹک

ابتدائے نگارش :- ۴۶-۱۹۴۷ء (آٹھ نو سال کی عمر سے، تقریباً)

مطبوعہ تصانیف :ــــ

خواب زار	(شعری مجموعہ)	۱۹۶۸ء
خواب زار	(دوسرا ایڈیشن)	۱۹۷۲ء
سیما	(ناول)	۱۹۶۸ء
اِک چاند چمکتا ہے	(شعری مجموعہ)	۱۹۷۶ء
شبنم شبنم	(شعری مجموعہ)	۱۹۸۶ء
برف کے پھول	(افسانے)	۱۹۸۹ء

غیر مطبوعہ تصانیف:—

سلیم (ناول) —
اے غم یار (ناول) —
نعت و سلام (شعری مجموعہ) —
رم جھم رم جھم ساون برسے (گیت اور بھجنوں کا مجموعہ) —
— اور —
ایک ناولٹ

سرگرمیاں:—

رکن انجمن ترقی اردو، شاخ میسور
رکن اردو جرنلسٹ اینڈ رائٹرز ایسوسی ایشن میسور
رکن الحسنات اردو اکادمی۔ بنگلور
(کرناٹک اردو اکادمی کی بھی تین بار رکن رہ چکی ہیں)

ایوارڈز:—

کرناٹک سرکار کا سب سے اہم "راجیہ اتسواد" ایوارڈ: نومبر ۱۹۸۷ء
کرناٹک اردو اکادمی ایوارڈ برائے اعلیٰ تصنیف "شبنم شبنم پر" ۱۹۸۸ء
غالب کلچرل اکیڈمی بنگلور کا غالب ایوارڈ — ۱۹۸۹

پیش لفظ

اُردو افسانے کا آغاز پریم چند سے مانا جاتا ہے حالاں کہ یہ صنف اُن سے پہلے وجود میں آ چکی تھی۔ کہا یہ جاتا ہے کہ افسانے کے فنی تقاضوں کا احساس و ادراک اور ان کی پاسداری کی باقاعدہ روایت پریم چند سے شروع ہوئی اور یہ بات درست بھی ہے۔ پریم چند کی روایت کو اُن کے بہت سے پیرو کاروں نے جن میں اعظم کریوی اور علی عباس حسینی جیسے ادیبوں کے نام شامل ہیں، آگے بڑھایا اور ترقی پسند افسانہ نگاروں نے بھی خود کو ان کا معنوی وارث قرار دیا۔ پریم چند سے ترقی پسندوں تک افسانے کا تانا بانا زندگی میں پیش آنے والے خارجی واقعات اور حادثات سے بُنا جاتا رہا ہے۔ افسانہ محض بیانِ واقعات سے عبارت نہ تھا۔ پریم چند اور ان کے پیرو کار افسانے سے سماجی اصلاح کا کام بھی لینا چاہتے تھے۔ اُن کا یہ اصلاحی نقطۂ نظر ان کے افسانوں میں

جگہ جگہ دکھاتا ہے۔ ترقی پسند افسانہ نگار ایک انقلابی اندازِ فکر رکھتے تھے اور بُرے پہلوؤں کی اصلاح کے بجائے سماج کی مکمل تبدیلی پر زور دیتے تھے جس کا حتمی نسخہ ان کے نزدیک اشتراکیت تھی۔

لیکن ان دو میلانات کے ساتھ ساتھ ایک تیسرا میلان بھی تھا۔ اس میلان کے نمائندہ افسانہ نگار افسانے کو نہ تو محض بیانِ واقعات تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ نہ وہ اسے سماجی اصلاح یا انقلاب کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ ان کا زور کردار نگاری پر تھا جس کے وسیلے سے وہ انسان کی داخلی دُنیا میں جنم لینے والی کہانیاں سُنانا چاہتے تھے۔ انسان کے اندر جو کہانیاں جنم لیتی ہیں، ان کے محرکات بھی خارج میں موجود ہوتے ہیں اس لیے یہ کہانیاں جہاں ایک طرف کسی کردار کے باطن سے قاری کو آشنا کرنے والی ہیں وہیں اس کے گردوپیش سے بھی اسے متعارف کرادیتی ہیں۔ اِس ذیل میں غلام عباس، منٹو اور کچھ دوسرے افسانہ نگاروں کے نام لیے جا سکتے ہیں جنھیں جدید افسانے کا پیش رو سمجھا جاتا ہے۔

لیکن جدید افسانہ دھیرے دھیرے خارج سے اپنا رشتہ مکمل طور پر قطع کرتا گیا اور اس طرح اس نے ایک ایسی پیچیدہ CASE HISTORY کی شکل اختیار کر لی جسے ماہرین کی مدد کے بغیر سلجھایا نہ جا سکے۔ افسانے سے پلاٹ، کردار، مکالمہ سبھی نکال باہر کیے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ افسانہ چند مبہم جو ناقدینِ ادب کی دل چسپی کا سامان بن کر رہ گیا اور عام قاری اس سے دور ہوتا چلا گیا۔ اس صورتِ حال سے یہ ناقدینِ ادب تو بہت خوش تھے کہ اب افسانہ ان کی عالمانہ موشگافیوں کی بیساکھیاں لگا کر ہی عام قاری تک پہنچ سکتا تھا لیکن ایک مرحلے پر خود افسانہ نگاروں نے محسوس کیا کہ یہ بیساکھیاں بھی بیکار ہو چلی ہیں۔ اور جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں اُسے تنقیدی پشت پناہی کے باوجود کوئی پڑھنے کو تیار نہیں۔ یہ احساس افسانے کے حق میں ایک نیک فال تھا اور اس کے نتیجے میں افسانہ اب پھر اپنے گم شدہ فنی خدوخال حاصل کرنے لگا ہے۔

ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ اس بے رہ روی کے شکار زیادہ تر مرد افسانہ نگار ہوئے اور خاتون افسانہ نگاروں نے اس کی گرد بھی اپنے دامن پر نہ پڑنے دی قرۃ العین حیدر

کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ کہانی میں شعوری ترتیب وتنظیم کی قائل نہیں لیکن یہ محض الزام ہے۔ بکھراؤ اور انتشار کی ایک زیریں لہر کے باوجود ان کی کہانیاں فنی نظم وضبط کا بہترین نمونہ ہیں اور کردار نگاری کے علاوہ سماجی فضا آفرینی کا عمل بھی اُن کے ہاں اپنی اعلیٰ ترین شکل میں نظر آتا ہے۔ دل چسپی کا عنصر بھی جو افسانے کا بنیادی جوہر ہے، ان کے تجزیاتی اور مطالعاتی اندازِ نظر کے باوجود کہیں زائل نہیں ہوتا۔ دوسری خاتون افسانہ نگاروں نے بھی افسانے کے اصل خدوخال کو دُھندلا ہونے سے بچایا ہے اور اُلجھی ہوئی سے اُلجھی ہوئی "آپ بیتی" میں بھی "جگ بیتی" کا وہ رنگ بھرا ہے جو کسی واردات یا واقعے کو کہانی کا روپ دینے کے لیے ضروری ہے۔

حسنیٰ سرور ایک معروف خاتون افسانہ نگار ہیں۔ مجھ سے اور میری طرح شاید پوری اُردو دُنیا سے اُن کے اوّلین تعارف کا ذریعہ ان کی شاعری بنی تھی جس کی آڑ میں ایک جذباتی احساس مگر شائستہ اور مہذب نسائی کردار جلوہ گر تھا۔ اس کردار کے کچھ معصومانہ خواب تھے: خوب صورت زندگی کے خواب جو ناتجربہ کاری کی خوش نما سنہری دُھند میں لپٹے ہوئے نظر آتے تھے —— پھر وہ شاعری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہوئیں اور جلد ہی اس صنفِ ادب میں بھی انھوں نے اپنی پہچان قائم کرلی۔

حسنیٰ سرور کی شاعری کی طرح میں ان کے افسانوں کا بھی قاری رہا ہوں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے اندازِ نظر میں گہرائی اور گیرائی بڑھی ہے۔ رومانی دھندلکوں سے نکل کر انھوں نے حقیقت کی چلچلاتی دھوپ سے آنکھیں چار کی ہیں، زندگی کی لطافتوں کے علاوہ زندگی کی کثافتوں کو بھی لکھنے کی ہمت کی ہے اور اس لیے اب ان کے مشاہدات جب کاغذ پر منتقل ہوئے ہیں، خواہ شاعری کے روپ میں، خواہ افسانے کی شکل میں، تو یہ ان کے مشاہدات نہ رہ کر ہم سب کے مشاہدات بن جاتے ہیں اور ہمیں ایک ایسی دُنیا کی سیر کراتے ہیں جو ہماری دیکھی بھالی، جانی پہچانی دُنیا ہے مگر ہمیں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ جس نظر سے ہم اس دُنیا کو آج دیکھ رہے ہیں، شاید اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا اور یہ نئی نظر ہمیں حسنیٰ سرور نے دی ہے۔ میرے نزدیک ایک اچھے تخلیقی فن پارے کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے۔

اس مجموعے میں حسنیٰ سرور کے جو افسانے شامل ہیں انھیں فنی لحاظ سے تو ہم سطح نہیں کہا جاسکتا مثلاً "ریت کی دیواریں" اور "لال ساڑی" کو تقابل کی میزان میں رکھا جائے تو سارا جھکاؤ "ریت کی دیواریں" والے پلڑے کی طرف ہوگا، لیکن ایک چیز ان میں مشترک ہے: ایسے موضوعات کا انتخاب جو حقیقی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، ایسی زندگی جسے کہیں نہ کہیں جیا جا رہا ہے اور جس کے نشیب و فراز سے جنم لینے والے واقعات ہمیں اپنی طرف فوراً ہی متوجہ کر لیتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے کہا، حسنیٰ سرور حالات و واقعات کو حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کرنے کا ہنر سیکھ چکی ہیں لیکن انسانی رشتوں کا ذکر ہو تو ان کا لہجہ اب بھی جذباتی ہو جاتا ہے۔ اسے ان کے اسلوب کی پہچان بھی کہا جاسکتا ہے لیکن اگر وہ اس پر زیادہ اصرار نہ کریں تو شاید فنی احتساب کے تقاضوں سے زیادہ کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوسکتی ہیں۔

مخمور سعیدی

دہلی،
۲/ اکتوبر ۸۹ء

"....میرا تخلیقی سفر عموماً خواب زار سے ماحول میں طے ہوتا ہے۔
جہاں اِک چاند چمکتا ہو، ستاروں کے قافلے پلکیں جھپکاتے ہوئے آسمان
کی وُسعتوں میں سفر طے کر رہے ہوں۔ اُداس چاندنی ماحول کو شبنم
بنائے ہوئے ہو، احساس جاگ رہا ہو، جذبات سُلگ رہے ہوں، شعور
بیدار ہو، تب ہی تو تخلیق کا کرب پیدا ہوتا ہے۔"
حسنیٰ سرور

گھر ہونے تک

اس کی ہرنی جیسی آنکھوں میں عجیب سی اُداسی تھی۔ نامعلوم سا خوف اور دہشت سی ہیں جب اسے دیکھتی، جانے کیوں دل کھنچا جاتا۔ دیکھوں۔ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے۔ اتنی معصوم اور پیاری شکل تھی کہ میرے دل کے آئینے میں اُتر آئی تھی۔ بوٹا سا قد۔ گندمی رنگ۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ ننھا سادہانہ اور گھنگھریالے بالوں کا بکھرا بکھرا سا بوجھ گردن پر لیے وہ ایک کم عمر نادان سی لڑکی تھی۔ کبھی کبھار کمپونڈ کے پاس نظر آتی۔ ایک منظر۔ ایک جھلک دکھا کر تیزی سے اندر چلی جاتی اور دروازہ بند ہو جاتا!! وہ حال ہی میں ہمارے سامنے والے مکان میں آئی تھی۔ میں حیران تھی کیا اس کے ساتھ اور کوئی نہیں رہتا؟ سوا اس نوجوان کے جو صبح گھر سے نکلتا ہے تو رات گئے واپس آتا ہے۔ کون ہے یہ نوجوان! بھائی یا کوئی رشتہ دار۔؟ اور وہ ننھی سی لڑکی دن بھر گھر میں کیوں قید رہتی ہے؟ ایسا لگتا ہے کوئی ننھی سی سبز پری کسی دیو یا جن کی قید میں ہو۔

سہمی سہمی۔ ڈری ڈری سی۔ جانے کون ہے وہ؟

پھر ایک صبح غل غپاڑے نے مجھے وقت سے پہلے جگا دیا۔ سامنے والے مکان میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ ایک مرد کی آواز تھی دوسری کسی عورت کی۔ یہ آواز اس لڑکی کی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ کوئی پختہ عمر کی عورت تھی جو چلّا رہی تھی۔

میں نے اپنا دھیان دوسری طرف ڈال دیا۔ دیر تک آوازیں کانوں سے ٹکراتی رہیں۔ اپنے کام میں مشغول رہ کر بھی میرا خیال اُدھر ہی مڑ جاتا۔ اور میں سوچنے لگتی۔ یہ کون جھگڑ رہا ہے؟ کیوں!!!

دوپہر ڈھلے میں اپنے صحن میں پودوں کی دیکھ بھال کر رہی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر کی مضبوط بدن والی عورت میرے پاس چلی آئی۔

"نمستے جی۔" میں نے حیران ہوتے ہوئے اسے دیکھا۔ میں رادھا کی ماں ہوں جی! رادھا سامنے رہتی ہے نا" وہ خود ہی بولی "اچھا۔ اچھا"

"ہاں بی بی جی! وہ میری بچی ہے۔ مردار زندہ ہے۔ مر گئی۔ ہاسٹل میں پڑھنے کو رکھا تھا مگر یہ کھیل کھیلا ہے اس نے۔ اپنی پسند سے اس لڑکے کے ساتھ بھاگ آئی ہے کہتی ہے کہ شادی کر چکی ہوں سن کر دوڑی آئی۔ آخر اپنا خون ہے کیسے اس کی بربادی دیکھتی۔ سمجھا بجھا کر واپس لے جانا چاہتی ہوں مگر وہ ساتھ چلنا نہیں چاہتی۔ کم بخت! اور وہ ظالم کمینہ مجھ سے ہی لڑنے لگا" عورت منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ میں یہ کہانی سن کر حیران رہ گئی۔ اتنی کم سن اور یہ کرتوت! مجھے اس عورت پر رحم آنے لگا۔

"مت رو بہن! آخر تمہاری اولاد ہے ایک دن سنبھل جائے گی۔ تم اسے نرمی سے سمجھا کر لے جاؤ۔"

"دونوں نے دھکے دے کر مجھے گھر سے نکالا ہے بی بی! کاش۔ میں یہ دن نہ دیکھتی۔ بھگوان کسی کو ایسی اولاد نہ دے۔ میں بھی دیکھتی ہوں وہ کیا کرتا ہے۔ کیسے نہیں بھیجتا میری بچی کو۔ گیا۔ میں اسے جیل بھجوا دوں گی۔ ہاں! وہ روتی بکتی چلی گئی۔

اور میرے دل میں رادھا کے لیے نفرت کا زہر گھل گیا۔ اس معصوم پیاری سی شکل کے اندر اتنا مکروہ چہرہ۔ کیا وہ اتنی گری ہوئی لڑکی ہے جو ماں کو ٹھکرا ایک غیر مرد کے ساتھ ہنسی خوشی رہ رہی ہے۔!

لیکن۔ ان خاموش نگاہوں میں وہ اداس سی مدھم سی کیفیت کیسی ہے؟ ایک خوف سا؛ ایک دہشت سی کیسی ہے؟!!!

منی کا گیند رادھا کے کمپونڈ میں جا گرا تھا۔ وہ لینے کے لیے دوڑی تو میں نے سختی سے ڈانٹ دیا "منی ادھر مت جاؤ"

"ممی میرا بال" وہ رونے لگی "کوئی بات نہیں دوسرا لے لینا" اور یہ دیکھ کر مجھے غصہ آگیا کہ رادھا منی کا بال ہاتھ میں لیے گیٹ پر کھڑی اسے بلا رہی ہے "بے بی۔ اپنا بال لے جاؤ" میٹھی سی پرکشش آواز تھی وہ۔ منی نے خوفزدہ ہو کر مجھے دیکھا "نہیں۔" میری آواز میں سختی تھی

وہ سہم گئی۔ اور میرے پیچھے چھپ گئی۔" بے بی اپنا بال لے لو۔" اس کے ہونٹوں پر ایک ننھا سا تبسم تھا اور جانے کیوں میں اسے جھڑک نہ سکی۔ چپکے سے کہہ دیا۔"ادھر پھینک دو" میری نگاہیں غیرارادی طور پر اس سے مل گئیں۔ وہ مسکرائی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جس میں اپنائیت کا بر تو ہوتا ہے۔ میرا دل پل بھر کو کھنچ گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے نفرت کی ایک تند لہر اٹھی۔ اور دل ڈوب ڈوب گیا۔ میں کچھ کہے بنا اندر مڑ گئی۔ اور منی کو منع کر دیا کہ ادھر جایا نہیں کرتے۔ دوسری مرتبہ پھر سے رادھا کی ماں آئی تو خوب خوب لڑائی ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک اور نوجوان بھی تھا۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ برآمدے میں رادھا کھڑی رو رہی ہے

"ماں! تم چلی جاؤ۔ ماں بھگوان کے لیے چلی جاؤ۔ کیوں میرے پیچھے پڑی ہو۔ میرا جیون کیوں برباد کرتی ہو ماں!۔"

"نہیں۔ تجھے بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ ورنہ میں پولیس کو خبر دیتی ہوں۔ چل میرے ساتھ۔" وہ رادھا کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہی تھی۔

" نہیں۔ نہیں ماں۔ تم میرا بیوپار مت کرو۔ اس سے پہلے میرا گلا گھونٹ دو تم۔ تم کیسی ماں ہو۔"

اسی لمحے رادھا کا ساتھی بھی آگیا۔ اور خوب گالی گلوچ ہوئی رادھا کی ماں روتی چلاتی باہر نکل گئی۔

میں حیران ہوتی رہی کہ آخر یہ کیا قصہ ہے ماں بیٹی کا۔ کچھ ہی دیر بعد میرے دروازے پر رادھا کھڑی تھی۔ تھر تھر کانپتی ہوئی۔ شمع کی لو کی طرح زرد۔ زار زار روتی ہوئی۔

میرا دل پسیج گیا۔"کیا بات ہے رادھا؟ یہ جھگڑا کیا تھا؟" وہ سسکنے لگی۔" آنٹی راکیش ابھی باہر گیا ہے۔ اس کے آنے تک مجھے یہاں رہنے دو۔ میں سب باتیں بتادوں گی۔ آپ مجھے بچا لو۔ آنٹی!۔

"چلو اندر چلو بیٹھو گھبراؤ نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ وہ ذرا سنبھلی تو پوچھا۔"تم اپنی ماں کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتیں یہ روز روز کے جھگڑے اچھے نہیں لگتے۔"

"آنٹی!۔ تو کیا ماں یہاں بھی آئی تھی۔؟"

"اس نے کیا کہا؟" اس کی آنکھوں کی دہشت اور بڑھ گئی اب میں اس ننھی سی بچی سے کیا کہتی۔
میرے ہونٹ کھل نہ سکے۔
"آنٹی میری ماں بڑی ظالم ہے اس نے زبردستی کر کے مجھے ہاسٹل سے نکالا۔ پڑھنے بھی نہ دیا۔ میرا امتحان قریب تھا۔ ضد کر کے گھر لے گئی کہ دو دن میں واپس چلی جانا۔ وہاں سے ایک دن کار میں مجھے مندر لے گئی۔ میری بڑی بہن بھی ساتھ تھی۔ مندر پہنچے تو دیکھا راکیش بھی کھڑا تھا پھر آنٹی سب لوگوں نے مل کر مجھے مجبور کیا کہ راکیش کو ورمالا پہنا دوں۔ ہماری شادی ہو رہی ہے۔ میں رونے لگی۔ مجھے کیا معلوم شادی کیا ہوتی ہے؟۔ ماں نے سمجھایا تو میرے ہی پاس رہے گی۔ اب صرف بھگوان کے سامنے ورمالا پہنا دے۔ اور یوں راکیش سے میری شادی کر دی گئی۔ یہ دیکھو منگل سوتر راکیش نے پہنایا ہے"۔ رادھا اپنے گلے کا منگل سوتر دکھانے لگی۔
"رادھا۔ مگر تمہاری ماں کہتی تھی کہ تم نے اپنی مرضی سے ......"
"نہیں۔ نہیں۔ بھگوان کی قسم آنٹی۔ یہ سب کچھ ماں نے کیا ہے وہ مجھے ہر جگہ۔ یوں ہی بدنام کرتی ہے۔"
"اچھا تو کیا۔ راکیش کے ماں باپ کو اس شادی کا علم نہیں رادھا۔؟"
"مندر میں راکیش کی ماں بھی تھی۔ وہ مندر سے مجھے اپنے گھر لے گئی تھی۔ اچھے کپڑے پہنائے تھے۔ کھلایا پلایا تھا۔ دو چار دن بعد ماں مجھے گھر لے آئی۔ میں نے ضد کی کہ مجھے ہاسٹل بھیج دو۔ میرا امتحان ہے۔ میں پڑھوں گی۔ مگر ماں راضی نہ ہوئی۔ مجھے خوب مارا پیٹا۔ کچھ دنوں بعد مجھے راکیش کے ساتھ یہاں بھیج دیا۔ مجھے ڈر لگتا ہے آنٹی میں کیا کروں"۔
وہ پھر رونے لگی۔
بمشکل بارہ تیرہ سال کی لڑکی کتنی معصوم تھی۔ کتنی مظلوم بھی"۔ اور اب یہ کیا قصہ ہے۔؟"
"اب ماں نہیں چاہتی کہ میں راکیش کے ساتھ رہوں ——— وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہے۔ راکیش نے کہا تھا وہ ہمارے پاس ہی رہ جائے مگر ماں نہیں مانتی۔ پہلے کچھ دن ہم دوسرے مکان میں تھے ! تو ماں ساتھ تھی۔ دن رات لڑتی تھی

راکیش سے بہت سارو پیہ بھی لیا۔ آنٹی جانے کیا کرتی ہے؛ میرا دل اندر ہی اندر کڑھنے لگا۔ یہ کیسی دنیا ہے۔ کیسے لوگ ہیں۔ رادھا جو کہہ رہی ہے کیا یہ سچ ہے۔ یا یہ جوان کی ماں نے کہا تھا وہ سچ تھا؛ میں یقین اور بے یقینی کے ترازو پر ڈول رہی تھی کہ رادھا بولی "آنٹی۔ میں کیا کروں مجھے بتائیے نا۔ ماں کہتی ہے وہ مجھے کسی دوسرے لڑکے سے بیاہ دے گی۔ وہ اس سے اچھا لڑکا ہے۔ ڈاکٹری پڑھ رہا ہے۔"

"ارے؛" میرے تو اس پر جیسے زوردار بجلی گر پڑی۔ اور ایک ماں کی ٹھوس عظمت ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتی چلی گئی۔ راکھ بنتی چلی گئی۔

یہ کیسی ماں ہے؛۔ اپنی لڑکی کا بیوپار کر رہی ہے کیا؛ روپیہ پیسے کی حرص نے اس کے جذبات کو کھوکھلا کر دیا ہے؛ کیا وہ رادھا کی کچی جوانی سے کھیل رہی ہے؛ اسے ایک طوائف کے سانچے میں ڈھال رہی ہے؛ یہ کیسی ماں ہے؛ نہیں نہیں۔ کوئی ماں اتنی نیچ نہیں ہو سکتی ۔ یہ اپنی بلندیوں سے زمین کی مکروہ پستیوں میں نہیں گر سکتی۔

"رادھا! کیا وہ تمہاری سگی ماں ہے؟" میں بھرے گلے سے پوچھ بیٹھی۔ "ہاں۔ پتا جی کو سورگباش ہوئے چار سال گزر گئے ماں نے میری بہن کو بھی ایک امیر لڑکے سے بیاہا تھا۔ بہن اس سے لڑ جھگڑ کر چلی آئی تھی۔ اور اب وہ کسی دوسرے آدمی سے شادی کر چکی ہے۔ بہن بھی کہتی ہے کہ راکیش سے تیری شادی نہیں ہوئی تھی۔ اب ہم دوسرے لڑکے سے تجھے بیاہ دیں گے۔ میں کیا کروں۔ میں کیا کروں؟"

رادھا کی سسکیاں میری روح کی بنیادوں کو ہلاتی رہیں۔ میں نے جان لیا کہ رادھا کی ماں اور بہن کس قماش کی عورتیں ہوں گی لیکن معصوم رادھا کی زندگی وہ یوں برباد تو نہیں کر سکتیں اس کی رگ رگ میں ذلت اور کراہیت کا زہر نہیں بھر سکتیں ۔

"تمھیں راکیش کیسا لگتا ہے؟" یہ پوچھتے ہوئے میری آواز کپکپا اٹھی کیونکہ رادھا میری بچی کے برابر تھی۔ ناسمجھ اور معصوم ایک لمحے کو اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں تعجب کا رنگ سا امنڈا۔ پھر وہ سر جھکا کر بولی "مجھے نہیں معلوم!"

اس کا یہ سادہ سا جواب میرے دل میں تیر بن کر اتر گیا۔ اور ممتا کو لہولہان کر گیا۔

"اچھا یہ کہو وہ تمھارا خیال رکھتا ہے؟" "ہاں۔ روز روز اچھی اچھی چیزیں لاتا ہے۔ کھلاتا ہے پلاتا ہے۔ کہتا ہے میں تمھیں ماں کے ساتھ نہیں جانے دوں گا۔ اب اگر ماں آئی تو پولیس کو بلا لوں گا۔"

"اچھا تم ڈرو نہیں۔ ہم راکیش کو بھی سمجھا دیں گے اور تمہاری ماں کو بھی۔!"

"آنٹی۔" وہ میرے سینے سے لگ گئی۔ اور سسکیاں بھر بھر کر روتی رہی۔ اور میری آنکھوں سے چند آنسو چھلک کر اس کے گھنگھریالے بالوں میں جذب ہو گئے۔!!

اس رات راکیش دیر سے گھر آیا تب تک رادھا میرے پاس رہی۔

پھر یہ معمول سا بن گیا کہ جب بھی وہ باہر جاتا رادھا کو میرے پاس چھوڑ جاتا۔ پتہ چلا کہ رادھا کی ماں نے اپنی بیٹی کا بیاہ دینے کا وعدہ کر کے راکیش سے بہت سارا روپیہ اینٹھ لیا تھا۔ راکیش کی کافی زمینداری ہے۔ شہر میں بزنس کرتا ہے۔ فراخدل اور ہمدرد بھی ہے۔ وہ اپنے خرچ سے کئی لڑکوں کو پڑھاتا بھی رہا ہے۔ رادھا کی ماں اس کے پڑوس میں رہتی تھی۔ رو دھو کر پیسہ مانگ لیا کرتی تھی۔

پھر اس نے اپنی بیٹی کو اس سے بیاہ دینے کا وعدہ کر لیا۔ اور ایک دن مندر میں راکیش کی ماں کی موجودگی میں ہی دونوں کا بیاہ کرا دیا۔ وہ چاہتی ہے کہ راکیش اب بھی روپیہ دیتا رہے وہ اور اس کی بڑی لڑکی دونوں مل کر اسے خوب لوٹ چکے ہیں۔ اب راکیش نے روپیہ دینا بند کر دیا ہے اور چاہتا ہے کہ بڑھیا اس کے ساتھ ہی رہ جائے۔ مگر وہ یوں راضی نہیں ہوتی۔ اسی لیے اب اس نے یہ چال چلی ہے کہ لڑکی کو بہکا کر لے جائے۔ وہ ایک اور مال دار لڑکا پھانس رہی تھی جو رادھا کی ایک جھلک پر مرمٹا تھا۔ اس دوران بڑھیا کئی بار آ چکی تھی۔ اور سڑک پر کھڑی بکتی جھکتی واپس ہو گئی تھی۔ وہ نوجوان بھی اس گلی کے کئی چکر لگاتا نظر آتا تھا۔

مشکل یہ تھی کہ راکیش پولیس میں رپورٹ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ رادھا کم سن تھی۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔

ایک بار رادھا بولی "آنٹی! کیوں نہ میں ماں کے ساتھ چلی جاؤں! یہ روز روز کا جھگڑا ختم ہو گا!"

"نہیں رادھا! اچھی لڑکیاں ایسا نہیں کرتیں وہ تمھاری زندگی خراب کر دے گی۔ راکیش تمھارا پتی ہے۔ تم کو اس کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔ تم ڈرو نہیں! کوئی کچھ نہ کرے گا تم ماں سے کہہ دو کہ تم راکیش کو نہیں چھوڑو گی۔ جب تمھیں سمجھ آجائے گی تب معلوم ہوگا کہ دنیا کیا ہوتی ہے۔ راکیش اچھا لڑکا ہے۔ وہ تمھیں آرام سے رکھے گا۔ میری باتیں سن کر وہ چپکے چپکے روتی رہی۔ جذبات سے عاری چہرے پر بھولا پن تھا۔ بچپن کی معصومیت تھی۔ ناسمجھی کا کچا کچا رنگ تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ شوہر کیا ہوتا ہے۔ اور بیوی کیا۔!۔

اسے راکیش سے محبت بھی نہیں تھی نفرت بھی نہیں۔ وہ کبھی ماں کے پاس جانا چاہتی اور کبھی راکیش کے ساتھ رہنا چاہتی۔ اس کی زندگی ایک کٹی پتنگ کی طرح تھی جس کا کوئی ٹھکانہ نہ ہو۔ جس نے بھی باندھ لیا اُس کی ہو گئی۔ چاہے وہ راکیش ہو یا کوئی اور رادھا نے میرے پاس رہ کر پکوان بھی سیکھ لیا تھا۔ ہوٹلوں کا کھانا کھا کر وہ بیزار ہو گئی تھی۔ بار بار دوڑی آتی "آنٹی۔۔۔ ترکاری کیسے بناتے ہیں؟ آنٹی کھچڑی پکانا سکھا دیجئے۔!

ایک صبح وہ بولی "ہم دوسرے محلے میں جاکر رہیں گے۔ راکیش نے مکان دیکھ لیا ہے۔ میں آپ کو چھوڑ کر کیسے جاؤں آنٹی۔؟"

میرا دل بھی دکھ گیا۔ نہ معلوم اس کا مستقبل کیا ہو؟ یہاں رہتی تو جب بھی گھبراتی میرے پاس چلی آتی۔ اور میں اسے اچھی راہ دکھانے کی کوشش کرتی۔ مگر اب۔؟!

پھر جب وہ جانے لگی تو میں نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بھرے گلے سے کہا "میری بات یاد رکھنا رادھا بیٹی! کبھی راکیش کا ہاتھ نہ چھوڑنا۔ تم ایک اچھی لڑکی ہو۔ اچھی بیوی بن کر دکھانا" وہ آنسو پونچھتی چلی گئی۔ مکان خالی ہو گیا۔ گلی سنسان ہو گئی لیکن میری آنکھوں سے اس کی وہ ہرنی جیسی آنکھیں نہ جا سکیں۔ سما کر رہ گئی تھیں۔ جیسے شیشے میں عکس بھر گئی دنوں بعد وہ مجھ سے ملنے آئی۔ ڈری سہمی سی لگی

"کیا بات ہے؟ اچھی تو ہو؟"

"اچھی تو ہوں آنٹی۔ آپ بہت یاد آ رہی تھیں"

"بیٹو! میں بھی بہت یاد کرتی ہوں تمہیں" میں چپ چاپ اسے ٹٹولنے لگی اپنی نگاہوں سے

ٹوٹنے لگی۔ وہ کمزور اور زرد ہو رہی تھی۔

"ماں اور بہن نے ہمارا پتہ چلا لیا ہے۔ اب وہ روز روز آ کر تنگ کرتی ہیں پرسوں جب راکیش کہیں گیا ہوا تھا میری بہن ماں اور ایک لڑکا جو ڈاکٹری پڑھ رہا ہے آئے تھے اور میرے ساتھ خوب جھگڑا ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ آج ہی میرے ساتھ اس کا بیاہ کر دو۔ ورنہ خاموش نہ رہوں گا تم لوگوں نے اب تک میرے دو ہزار روپیے ہضم کر لیے ہیں۔"

"پھر۔" میری سانسیں رکنے لگیں۔

"پڑوس والوں نے انھیں ڈانٹ کر بھگا دیا۔ آنٹی! کیا میں زہر کھا کر مر جاؤں گی! مر جاؤں گی۔"

وہ منہ چھپائے روتی رہی۔

میرا ذہن بڑی تیزی سے کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر میں بولی "گھبراؤ نہیں۔ تم راکیش سے کہو کہ وہ یہ شہر چھوڑ دے۔ کچھ دنوں کے لیے ہی تم لوگ کہیں دور چلے جاؤ۔"

راکیش سے ماں نے جھگڑا کر کے ابھی ابھی ایک ہزار روپیے لیے ہیں" "تم کوئی فکر نہ کرو بیٹی! بھگوان تمھاری مدد کرے گا تم لوگ جتنی جلدی ہو سکے کہیں دور نکل جاؤ۔"

"آنٹی میرے لیے دعا کرنا!" وہ پھر مجھ سے ملنے نہیں آئی لیکن اس کی وہ وحشتناک اور ویران سی آنکھیں بار بار میرے سامنے آتی رہیں!! آنکھیں جن میں کئی سوال تھے؛ حسرت و یاس تھی معصومیت تھی، میں ان آنکھوں کو کبھی بھلا نہ سکی۔ ہر جگہ ہر موڑ پر مجھے اُن آنکھوں کی تلاش رہی۔

پورے چار سال گزر گئے۔ وقت کی ریت لمحوں اور دنوں پر بچھتی چلی جا رہی تھی۔ اور پھر ذہن سے وہ آنکھیں بھی دور ہوتی چلی گئیں۔ رادھا کی یاد رفتہ رفتہ مٹتی گئی لیکن کبھی کبھی کسی کی بڑی بڑی آنکھیں دیکھ کر اس کی یاد آ ہی جاتی۔ جانے کہاں ہے؟ کیسی ہے؟ وہ ڈرپوک سی ناسمجھ لڑکی جو ایک ڈائن ماں کی حرص کا نشانہ بن گئی۔ اسی شام میں شاپنگ کر رہی تھی۔ کسی نے میرا آنچل پکڑ کر کھینچ لیا۔ میں چونک کر پلٹی "کون؟"

"مجھے نہیں پہچانا آنٹی؟ میں رادھا ہوں!" ------ میرے سامنے وہی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ میں اسے بے پناہ خوشی اور حیرت سے تک رہی تھی "تم۔ تم رادھا ہو نا! اوہ! کتنی بدل گئیں! اب کہاں ہو۔ کیسی ہو رادھا۔ تم تو ایسی گئیں کہ آنٹی کو پلٹ کر نہ پوچھا" میں ایک سانس میں اتنا سب

کہہ گئی۔ وہ سامنے کھڑی مسکراتی رہی۔ بھرپور مسکراہٹ! اور آنکھوں کی وہ دہشت، وہ مایوسی اب کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اُن آنکھوں میں ایک طرح کا ٹھنڈا اور میٹھا سا سکون تھا اور پاکیزہ سا نور بھی۔

وہ چپ چاپ مسکرائے جا رہی تھی۔ پھر چونک کر پلٹی اور پاس کھڑے نوجوان کی گود سے ایک گول مٹول بچہ اٹھا کر بولی "یہ دیکھو آنٹی! یہ ہے ہمارا گڈو! اور یہ راکیش ہیں میرے پتی۔!"

"یہ - یہ - یعنی کر رادھا۔ تم" میری آواز خوشیوں کے سرگم پر تھرتھرا اٹھی۔ راکیش نے ہاتھ جوڑ دیے "نمستے آنٹی! میں آپ کا بے حد احسان مند ہوں کہ آپ نے رادھا جیسی ناسمجھ لڑکی کو زندگی کا راستہ دکھایا تھا آپ ہی کی بات پر ہم مدراس چلے گئے تھے۔ اب ہم دونوں خوش ہیں۔ کسی کا کوئی خوف نہیں ہے۔ رادھا کی ماں نے ہمیں تنگ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اب وہ ہار گئی ہے۔!!"

"بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم دونوں نے ہمت اور ہم خیالی سے دنیا کو ہرا دیا۔ رادھا ایک اچھی لڑکی ہی نہیں ایک مثالی بیوی اور ایک اچھی ماں بھی ہے نا!!" میں نے بھیگی آنکھوں سے رادھا کو دیکھا! اس کے معصوم چہرے پہ پیار و محبت، وفا اور ممتا کی ملی جلی دھنک لہرا رہی تھی۔ وہی رادھا جو کل ایک بھولی بھالی معصوم سی بچی تھی آج ماں بن کر عظیم ہو گئی تھی۔ اس نے وہ جنت تعمیر کر لی تھی جو ازدواجی زندگی کی مسرتوں سے بھرپور تھی!!

OO

گمشدہ منزل کے مسافر

"تم ؟" دو حیران آنکھوں اور دو سنجیدہ ہونٹوں نے پوچھا۔
"تم ؟" دو پشیمان آنکھوں اور دو شرمردہ ہونٹوں نے پوچھا۔
یہ آنکھیں اپنی سی لگیں، اپنائیت کا وہ رنگ جو کہیں اور دوسری نگاہوں میں کبھی نہ ملا تھا۔
وہی رنگ ... آج برسوں بعد ... ان آنکھوں میں نظر آرہا تھا۔ جو برسوں پہلے کھو گئی تھیں۔
دھند اور مٹی کی دبیز چادروں کے پرے۔ غفلت اور نادانی کے گہرے ساگروں میں!
ایک لمحہ دو لمحے اور کئی لمحے بیت گئے۔ دونوں ایک دوسرے کے بالکل مقابل کھڑے
تھے۔ پاس پاس۔ اور چہروں پر پہچان کی لکیریں تھیں — پھر دونوں میں سے کوئی بھی کچھ نہ بول سکا۔
چونک کر، سنبھل کر سیٹیں ڈھونڈنے لگے۔ اتفاق سے دونوں کی سیٹیں برابر تھیں۔ ایئر ہوسٹس نے
انھیں ان کی سیٹوں تک پہنچا دیا — دونوں پھر ایک بار چونکے۔ آنکھوں نے پھر پوچھا "تم ؟!"
اور دونوں سہمے سہمے سے انجان بنے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں
گم تھا — یہ اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی۔ برسوں بعد قسمت ہم دونوں کو کس قدر قریب
لے آئی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو چھو سکتے ہیں محسوس کر سکتے ہیں۔ ہمارے جسموں کے درمیان
ایک دو انچ کا ہی فاصلہ ہے جو کسی پل مٹ بھی سکتا ہے!
میں۔ میں انھیں دیکھ سکتی ہوں چھو سکتی ہوں۔ لیکن دل کے اتھاہ سمندر میں ایک بھولا
بسرا طوفان سا ابھرا۔ لیکن ہمارے دل ایک دوسرے سے بہت دُور ہیں۔ اور ہمارے ذہن بھی

ایک نہیں۔ جانے ان کے دل میں کیا ہے۔؟ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔؟! ہم ایک دوسرے کے پاس رہ کر بھی کس قدر دُور ہیں، کتنی بڑی خلیج دلوں کے درمیان بن چکی ہے۔ جو ان دس برسوں میں پاٹی نہ جاسکی۔ دس سال۔ جیسے ایک عمر۔ ایک جگ۔

کاش! یہ سفر عمر کے اس دور میں نصیب ہوا ہوتا جبکہ میرا زخمی دل پچھتاوے کی آگ میں جل رہا تھا۔ جبکہ میں ہار کر۔ پچھتا کر بانہوں کی آن بناہوں میں جانا چاہتی تھی جو عورت کے لیے ایک مضبوط قلعہ سے کم نہیں۔ کاش قسمت بہت پہلے ہمیں اک دوسرے کے اتنا قریب ہونے کا موقع دیتی جس وقت کہ دلوں میں نفرت کی جڑیں اتنی گہرائی تک نہ اُتری ہوتیں۔ کاش!۔ کاش!!

مالا نے سر جھکا کر چپکے سے کنکھیوں سے اُسے دیکھا۔! اُس نے آنکھوں پر نیلا چشمہ چڑھا لیا تھا۔ اور انجان بنا نہ جانے سامنے کیا دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے اک آہ نکل گئی۔ اب ہوائی جہاز اڑان میں ہے۔ فضا کی بیکراں بلندیوں کی جانب اڑا جا رہا ہے۔ اس کے خیالات کا طائر بھی پرواز کر رہا ہے۔ صرف مالا ہی نہیں امر بھی اپنے خیالات کی ڈوریوں میں کسا جانے کیا کیا سوچ رہا ہے۔ اس کے چہرے کی گمبھیرتا اور بھی گہری ہو چلی ہے۔ پیشانی پر ایک دو شکنیں۔ لب بھنچے ہوئے۔

مالا۔! تم میرے سامنے کیوں آگئیں! میرے پاس میرے ساتھ تمہاری سیٹ کیوں لگ گئی ہے۔ کیا قدرت کوئی اور مذاق کرنا چاہتی ہے؟ کیا وقت کوئی اور کھیل کھیلنا چاہتا ہے؟ یہ تمہارے جسم سے اٹھتی ہوئی "او ڈی کولون" کی دھیمی دھیمی مہک کن بھولی بسری یادوں کی طرف لیے جا رہی ہے مجھے؟ تمہارے قرب کا طلسمی احساس کن خواب زاروں کی طرف اشارہ کر رہا ہے نہیں مالا۔ نہیں۔ بھگوان کے لیے مجھے کچھ نہ یاد دلاؤ۔ میں راکھ کا ایک ڈھیر ہوں۔ آسے کریدنے کا تمھیں کوئی حق نہیں پہنچتا۔ تم۔ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ چلی جاؤ۔

ہوائی جہاز اُڑ رہا ہے۔ ہلکے پھلکے بادلوں کی نرم سطح سے گزرتا ہوا ایسا لگ رہا ہے۔ جیسے تصورات ماضی کی دود صیا دھند کی چادروں کو چاک کر کے ٹوٹے ہوئے خوابوں کو تلاش کر رہے ہوں۔

مالا کی نگاہیں، نشست بدلتے ہوئے غیر ارادی طور پر امر کی جانب اُٹھ گئیں۔ وہ بھی

بڑا اور نیلگوں شیشے سے جھانکتی دو گہری چکیلی آنکھیں اس کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ آنکھیں جھپکیں جھپکنا بھول گئیں۔ لب کچھ کہنے کے لیے مچلے، کانپے لیکن کھل نہ سکے۔ جیسے اندر سے کسی نے انہیں بند کر رکھا ہو۔ جیسے دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہوئے بھی پہچاننے سے انکار کر رہے ہوں ___ جہاز کی گڑگڑاہٹ کانوں میں گونج رہی تھی! اور گرد و پیش کا احساس دلا رہی تھی۔ مالا نے جھجک کر پلکیں جھکا لیں اور امر نے بھی گھبرا کر منہ پھیر لیا۔

وقت پل پل بہتا رہا ___! مالا کی آنکھیں پھر امر کی جانب مڑیں۔ اور جیسے اپنے معبد کا طواف کرنے لگیں۔ وہی چوڑے چکلے شانے ___ وہی مضبوط گردن، بالوں کا وہی انداز۔ لیکن یہ کیا؟ کنپٹیوں کے پاس اجلی کرنوں کا باریک سا جال ابھر آیا ہے ___

تب تو بال بیحد سیاہ گھنگر یالے اور گھنے تھے۔ لیکن اب بال کم بھی ہو گئے ہیں اس کے جی میں آئی کہ آہستہ سے امر کے شانے پر ہاتھ رکھ دے۔ اور اپنائیت کا وہ لمس محسوس کر لے جس کے لیے وہ برسوں سے تڑپتی رہی ہے ___! یہی تو ہے میرا مندر ___ یہی تو وہ دہلیز ہے جہاں ماتھا ٹیکنے کی حسرت لیے ساری عمر سسکتی رہی ہوں۔ مالا کا لرزتا ہاتھ چپکے سے آگے بڑھا۔ دل کی دھڑکن جہاز کی آواز کو چیر کر بھی سنائی دے رہی تھی۔ ہاں مالا! یہی وہ لمحہ ہے جس کی تو متلاشی تھی ___ نہیں!!؟ اس کے ہونٹوں سے نکل گیا امر چونک کر پلٹا۔ مالا سہم گئی تھی۔ چہرہ پسینے سے شرابور امر کے لب پھر بھی نہ کھلے۔ اس کی آنکھوں میں اب بیگانگی کے گہرے رنگ تھے، نفرت کی دہکتی سی آگ تھی۔ مالا نے چپکے سے کھڑکی کی جانب نگاہیں مرکوز کر دیں۔ امر کی دھڑکنوں میں تلاطم تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی انجان نظروں سے مالا کو دیکھنے لگا۔ اس کا حسین چہرہ صرف آدھا ہی نگاہوں کی زد میں تھا! وہی ناک، وہی ہونٹ ___ وہی تراشیدہ سیاہ بال ___ لیکن یہ کیا؟ اب مالا کے بالوں میں یہاں وہاں چاندی جھلملا رہی ہے۔ اتنی جلدی؟ نہیں نہیں۔ مالا کی عمر ہی کیا ہے۔ ابھی تو ہماری شادی ہوئی ہے۔ ابھی تو ہمارے آنگن میں کوئی پھول بھی نہیں کھلا ___!! ___ مالا کا وہ عنابی رنگ کیا ہوا!! اس کے بھرے بھرے گالوں کو کس کی نظر لگ گئی ہے! مالا ___ مالا ___ تم مجھے چھوڑ کر اتنے دنوں کہاں چلی گئی تھیں؟ تمہارے بغیر میں نے زندگی شعلوں پر بسر کی ہے۔ دل کے گھاؤ لیے شہر شہر بھٹکتا رہا ہوں۔ تم نے مجھے جینے بھی نہ دیا تو مرنے بھی نہ دیا۔ مگر تم

اتنی اداس اتنی تنہا سی کیوں لگ رہی ہو۔ کیا تم بھی۔ میرے لیے تڑپتی رہی ہو؟ ۔۔ جواب دو مالا۔
۔۔ مالا! آمر کے ہونٹوں نے مالا کا نام لے لیا۔ وہ بے اختیار چونک کر مڑی ۔۔
۔تم ۔ آپ نے کچھ کہا؟! ۔۔ دونوں کی آنکھیں ملیں۔ گھبراہٹ شرمندگی پچھتاوا۔ کیا کچھ نہ تھا مالا کی آنکھوں میں؟ آمر آنکھوں آنکھوں میں اسے تولنے لگا۔ دل کی گہرائی میں اتر کر اسے جانچنے لگا۔
"آپ نے میرا نام لیا تھا؟" ایک آس نے پوچھا۔
"جی نہیں۔ میں آپ کا نام نہیں جانتا" نفرت نے بے رخی سے جواب دیا۔
مالا۔ زخمی ہرنی کی طرح تڑپ اٹھی۔ تکلف کی ساری دیواریں ایک ہی جھٹکے میں گراتے ہوئے بولی "تم یوں انجان نہیں بن سکتے آمر۔ میں جانتی ہوں میرا گناہ ایسا نہ تھا کہ فراموش کیا جاتا۔ لیکن تمہیں بتا دوں کہ جس بھول سے مجھے تم سے سدا کے لیے جدا کر دیا تھا اس بھول کی سزائیں ان دس برسوں میں بھگت چکی ہوں۔ اتنا کہ اب ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر چکی ہوں۔ تم تم اب اور سزا نہ دو امر۔ اب اور سزا نہ دو آمر" مالا کا لہجہ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا دل بھی زخمی تھا۔ وہ یہ چوٹ برداشت نہ کر سکا۔
"مالا۔ پلیز! اب زخم کریدنے سے کیا حاصل سوائے جلن کے، یہ کہو تمہیں کہاں جانا ہے"
وہ ایک طنزیہ ہنسی ہنس کر بولی "ایسی تو کوئی جگہ نہیں آمر جسے اپنا گھر کہہ سکوں۔ تقدیر کبھی کبھی یوں بھی ظالم بن جاتی ہے کہ ٹکنے کا آسرا بھی نہیں دیتی" وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ جیسے اپنے اندر اٹھتے طوفان کو دبا رہی ہو۔ اس کے رخساروں پر خون کی تیز گردش نے ہلکی سی سرخی ابھار دی ہے۔ نچلا ہونٹ بار بار کاٹ رہی ہے۔ پیشانی پر ننھے ننھے موتی جھلک آئے ہیں۔ امر سے دیکھا نہ گیا۔ اس نے چپکے سے پوچھ لیا "میں نے سنا تھا کہ تم جرمنی میں مقیم ہو گئی ہو تو کیا وہاں تمہارا گھر نہیں ہے؟!" مالا دھیمی ہنسی ہنس پڑی "کہیں مقیم ہو جانے سے وہ اپنا گھر نہیں کہلاتا! گھر تو وہ ہوتا ہے آمر۔ جہاں عورت مرد مل کر ایک دوسرے کے سہارے جیتے ہیں۔ تنہائی جس کا مقدر ہو وہ ہجوم میں بھی اکیلا ہوتا ہے۔ بے سہارا اور بے گھر" آمر کانپ اٹھا۔ مالا کی باتوں میں زہر گھلا ہوا تھا۔
"تو کیا!" وہ بات پوری نہ کر سکا۔ ادھورا سوال مالا کے لیے مکمل ہی تو تھا۔

"ہاں امر! جس کی خاطر تم سے ناطہ توڑا تھا جس کے موہ نے ایک بیاہتا عورت کی زندگی میں زہر گھول کر اُسے محبت کی حسین دنیا کے رنگ دکھانے تھے وہ کوئی مستقل سہارا نہ تھا۔ جرمنی پہنچ کر ہم M.S کر رہے تھے کہ وہ کسی اور کی بانہوں میں کھو گیا۔ اور رہ گیا ایک چہرہ — زخمی اور لہو لہان۔ اسے ملا پچھتاوہ — اور جلن" وہ ایک دو پل کو رُکی۔ نظریں نیچی کیے کیے ہی پھر بولی —— ایک بار جب پیروں تلے پھسلن آجاتی ہے امر تو انسان گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ سنبھل نہیں پاتا۔ چاہ کر بھی کھڑا نہیں ہو سکتا۔ کوئی اس گرتے کو سنبھالنا چاہے تو۔ اور بات ہے۔ تو ہاں! میں کہہ رہی تھی کہ تقدیر نے گن گن کر ایک ایک کر کے سارے بدلے لے لیے ہیں۔ ایک خطا کے جرم میں ان گنت سزائیں مل چکی ہیں مجھے۔ پردیس میں جب کوئی کسی کا اپنا نہ رہے تو وہ کتنا تنہا ہوتا ہے۔ کتنا بے آسرا؟! شاید تم یقین نہ کر سکو کہ غلط قدم کے فوراً بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ اپنے کیے پر پشیمانی تھی۔ شرمندگی تھی۔ لیکن جو قدم اٹھ چکا تھا وہ کیسے پلٹتا! زمانہ کیا کہتا امر؟!

"تم اپنے گھر بھی آسکتی تھیں مالا!" وہ ہولے سے بول اُٹھا۔

"امر؟!" ایک ناقابلِ یقین حیرانی اس کی آنکھوں سے سما گئی" تو —— تو کیا تم۔ مجھے قبول کر لیتے ؟!" وہ آہستہ سے بولی ——

"شاید —— اس لیے کہ گھر سے تم خود گئی تھیں میں نے نہیں نکالا تھا۔ اور جب کسی کو اپنے گناہ کا احساس ہو جاتا ہے تو خدا بھی معاف کر دیتا ہے۔" امر نے رُک رُک کر ایک ایک لفظ تولتے ہوئے جواب دیا۔

مالا کے پژمردہ ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی" احساسِ گناہ اور شکست ہی نے تو مجھے تمہارے پاس آنے سے روکے رکھا۔ زندگی کو میں نے ایک عذاب کی طرح سہا ہے امر! حالانکہ میں ایک بلند مرتبہ ڈاکٹر ہوں۔ میری عزت شہرت سب کچھ ہے لیکن ایک کمی ایک خلا کے سوا زندگی کچھ بھی نہیں "۔ مالا کی پلکوں پر دو آنسو آٹپکے۔ جس کو اس نے ہاتھ کی پشت سے پونچھ کر سر جھکا لیا۔ امر گم صم سا ٹوٹا بکھرا سا اُسے تکتا رہا۔ کیا کہے؟ کیا نہ کہے۔ نفرت کی پرتیں ایک ایک کر کے اُترنے لگیں — "تم نے نہیں بتایا۔ تم جا کہاں رہی ہو؟!"

مالا نے آہستہ سے سر اٹھایا اور اس کی جانب حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔
"میری کوئی منزل نہیں ہے! لیکن ایک بار اُس دھرتی کی مٹی کو اپنی مانگ میں بھرنا چاہتی ہوں جہاں میرا سہاگ رہتا ہے" ـــــ امر سارے بدن سے کانپ اٹھا۔ وہ ضبط کی چٹانوں سے پھسلتے پھسلتے بچا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہے مالا نے پوچھ لیا۔
"میں نے سنا تھا کہ تم شادی کر رہے ہو؟!" ـــ امر مسکرانے لگا
"شادی؟ اور ہاں! کی تو تھی ـــ" مالا کے چہرے پر کالی گھٹاؤں کا سایہ اُتر آیا۔ تب ہی امر بولا "شادی تو ایک بار کی تھی ـــ تم سے! پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا "بیاہ کے صرف تین مہینوں بعد جب تم ۲۰۵ کے لیے بمبئی چلی گئیں اور وہاں پہنچ کر تم نے اُس بیوقوف سے منہ موڑ لیا جس سے تمھیں یہ گلہ تھا کہ وہ تم سے والہانہ پیار نہیں کرتا ـــ اُسے محبت کرنا نہیں آتی۔ وہ صرف ایک بے حس پتھر ہے۔ صرف ایک محنتی ڈاکٹر ہے۔ شوہر نہیں!! وہی بے حس پتھر۔ تمھارا غم سینے سے لگائے زندگی بھر سلگتا رہا ـــــ زمانے نے ہنسی اڑائی۔ طنز کے پتھر پھینکے۔ ماں نے دوسری شادی کی بار بار صلاح دی مگر۔ مگر تمہارا پیار۔ اس سے بھلایا نہ گیا۔ نہ میں تمھیں معاف کر سکا نہ ہی بھلا سکا۔!!"
"امر خدا کے لیے اس ناگن کو کبھی معاف نہ کرنا۔ جس نے تمھیں جہنم کے غاروں میں دھکیل دیا ہے۔ کبھی معاف نہ کرنا۔ کبھی" وہ سسکنے لگی۔ اور تب امر نے چپکے سے ہاتھ بڑھا کر مالا کا ہاتھ تھام لیا۔ "مالا۔ ہماری منزل قریب آ رہی ہے۔ بنگلور میں ہمارا نرسنگ ہوم ہے۔" "مالا نرسنگ ہوم؟! وہ کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہے"
"نہیں ـــ!" وہ خوشی اور دکھ کے گہرے ساگروں میں ڈوبنے ابھرنے لگی اس کی آنکھوں سے موتی لڑھکتے رہے۔ اس نے لرزتا کانپتا ہاتھ امر کے شانے پر رکھ دیا اور کھوئی ہوئی اپنائیت کا اک گہرا احساس اس کی رگ رگ میں سرائیت کر گیا۔
جہاز سانتا کروز کے ہوائی اڈے پر رک چکا ہے ـــ امر مالا کا ہاتھ تھامے زینوں سے اُتر رہا ہے ـــ اُن کی منزل آ چکی ہے!!

OO

طوفان کے بعد

ایک مرد کی کہانی جو دو حصوں میں بٹ گیا

ایک دل کش سحر آگیں تبسم اس کے ترشے ہوئے ہونٹوں پر ہمیشہ بجا رہتا تھا گلاب کی دو پنکھڑیوں کی طرح اس کے لب شگفتہ تھے۔ آنکھوں میں کاجل کی لکیریں، بنی ہوئی بھنویں گالوں پر ہلکا سا غازہ، ماتھے پر میک اپ کی ہم رنگ بندی، گلابی شیفون کی ساڑی اور بلاؤز۔ اور لمبی سی ناگن کمر تک جھولتی ہوئی گوگرے کا بڑا سا گجرا، چوٹی کے ساتھ آویزاں.. رما آئینے کے سامنے کافی دیر سے موجود تھی۔ آج لیڈیز کلب میں پارٹی تھی۔ اور وہ چاہتی تھی کہ وہاں اس کی ٹکر کا کوئی نہ ہو۔ اس نے ایک بار پھر مختلف زاویوں سے آئینے میں اپنا عکس دیکھا اور اپنے آپ کہہ بیٹھی۔

'رما آج تو جانِ محفل ہوگی'۔ اور ہوا بھی یہی۔

وہ جونہی کلب پہنچی چاروں طرف سے تعریفی نظروں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ ہنستی بولتی اور قہقہے لگاتی رہی۔ زندہ دلی کے نغمے بکھیرتی رہی۔ سنجیدہ سی باوقار رما دوستوں کی محفل میں اپنے آپ کو بھول کر ایک شوخ الہڑ لڑکی کا بہروپ بھر لیتی تھی۔ وہ بے حد اسپورٹیو SPORTIVE تھی — بیڈمنٹن ہو کہ ٹیبل ٹینس، کیرم ہو کہ کارڈز وہ ہر گیم میں حصہ لیتی تھی۔ کلب کے ممبرز اس کی زندہ دلی کے گیت گاتے!۔ سب کے ہونٹوں پر رما کا نام ہوتا!؟

• بھئی رما تمہارا ابھی کوئی جواب نہیں۔ چڑیا کی طرح چہکتی ہوئی گیتا بولی۔

• تو کیا تمہاری طرح گھر کی چار دیواری میں دم توڑ دوں؟! رما نے جھٹ سے جواب دیا۔

نجمہ نے فوراً چوٹ کی۔ "ارے کہتی کیوں نہیں کہ کہاں تیری طرح بٹاشہ بن کر کالونی کے چکر لگاتے پھریں؟"
"گھر بار سنبھالنا۔ بچوں کی دیکھ بھال — بڑی مشکل سے تو کھیل کے لیے وقت نکالتے ہیں ہم لوگ —!"

"گویا صرف تم ہی گھروالیاں ہو —— ہم جیسے فٹ پاتھ پر رہتے ہیں"۔ رما کی حاضر جوابی کا بھی جواب نہ تھا۔

اس پر ایک جاندار قہقہہ پڑا۔

"بھئی اپنی اپنی فطرت پر ہے۔ تفریح، کھیل کود، وہ تو صرف ہماری رما کا حصہ ہے۔ دیکھو تو کیسے سلیقے کی زندگی ہے۔ ہر کام وقت پر کرتی ہے۔ ساتھ ساتھ مشین پر ڈھیر دل سلائی بھی کر لیتی ہے۔ ہے گیتا! تم دیکھو تو پھڑک اٹھوگی"۔ کمل رما کی گہری دوست تھی۔ وہ تعریف کے پھول برسانے لگی اور رما کے چہرے پر کئی رنگ آتے جاتے رہے۔

نجمہ نے کہا۔ "اچھا! تو بھئی۔ کسی دن ہم ضرور آئیں گے۔ تمھارے گھر تمھاری سلائی دیکھنے"۔
"لیکن بے وقت مت ٹپک پڑنا۔ پہلے سے اطلاع کر کے آنا۔ میں بزی رہتی ہوں"۔
"بڑی منہ پھٹ ہو جی!۔ ہم گھر آنا چاہیں اور تم فوراً ٹوک دو ۔ ۔ ۔ یہ کیا بات ہوئی؟"
"ہم تو من کے صاف لوگ ہیں چاہے کوئی برا ہی مانے! تم ضرور آؤ لیکن اطلاع کر کے، تاکہ میں وقت نکال لوں۔ بھئی بات یہ ہے کہ رما کے صاحب جو گھر پر رہیں گے کہیں ایسا نہ ہو کہ ..."
"شٹ اپ کیا بکواس ہے! میں تو کھیل کی بات کر رہی تھی۔ ہاں تو نجمہ! تم دوپہر میں بجے چلی آنا۔ بائی"۔ رما تیزی سے باہر چلی گئی۔

رما اپنا سارا کام ختم کر کے بستر پر لیٹی ہے۔ تھکن سے آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں — جسم ٹوٹ رہا ہے۔ رات کے نو بجنے کو ہیں۔ جوں جوں وقت کی گاگر چھلکتی جا رہی ہے اس کے دل میں عجیب زخمی احساسات جنم لیتے جا رہے ہیں۔ کون آئے گا جس کا انتظار کروں؛ سامنے والے کوارٹرز میں بچوں کی چہکار بھی ہے۔ شام چھ بجے ہی مسٹر اشوک آگئے ہیں۔ میں نے کھڑکی کی اوٹ سے دیکھا تھا۔ ریتا مسکراتی ہوئی اشوک کا استقبال کر رہی تھی۔ اور مسٹر اشوک نے اسے گہری مسکراتی نگاہوں سے دیکھا تھا اور چند لمحوں بعد شوخ ہنسی کی آواز آرہی تھی۔

میں کس کا انتظار کروں؟ یہ میرے بھاگ کی ریکھا میں نہیں کہ شوہر صبح کا گیا شام کو گھر آئے تو مسکراہٹ کے ہار لیے دروازے پر خوش آمدید کہوں! میری قسمت میں تو ایک طویل انتظار ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ کس کو میرے دل کی کسک کا احساس ہوگا؟ کون کام ختم ہوتے ہی دیوانہ وار گھر کی طرف دوڑا آئے گا۔ میری تقدیر میں تو بس یہی ہے کہ ایک گرہستی عورت کی طرح اپنے فرائض انجام دیتی جاؤں۔ مشین کی طرح گھر بار چلتا رہے۔ اپنی ساکھ پر کوئی حرف نہ آئے نینا کو اس بات کا احساس نہ ہونے دوں کہ اس کے ڈیڈی کس لیے اس قدر بزی رہتے ہیں؟ وہ ہر شام گھر کیوں نہیں آتے؟ اتوار کا سارا دن کہاں گزارتے ہیں؟۔۔

نینا کل بھی ضد کر رہی تھی ــ "ممی سب کے ڈیڈی اتوار کا دن گھر پر گزارتے ہیں۔ سب مل کر گھومنے جاتے ہیں۔ ہمارے ڈیڈی ہمارے پاس کیوں نہیں آتے۔؟"

"بیٹی تمہارے ڈیڈی بہت بڑے انجینیر ہیں نا! انھیں اپنے کام کے سلسلے میں باہر جانا پڑتا ہے۔" وہ اسے سمجھانے لگی۔ "یہاں دوسرے انجینیر بھی تو ہیں۔ پھر وہ اتوار کو گھر پر کیسے رہتے ہیں؟"

"بھئی! سب کے کام الگ ہوتے ہیں۔ ذمہ داری الگ ہوتی ہے اچھا! اب کے اتوار کو ہم پکنک پر چلیں گے۔"

"ممی۔؟" اور نینا سسک کر اس کے سینے سے لگ گئی جیسے اپنا دکھ بھولنا چاہ رہی ہو۔ رما کو لگا کہ دیواریں گرتی چلی جا رہی ہیں۔ پردے اُٹھتے جا رہے ہیں۔ اس کے سینے میں جوالا مکھی اُبل رہی ہے آنکھوں میں انگارے دہک اٹھے ہیں، وہ کیسے ضبط کرے؟۔ کیسے ضبط کرے۔ــــ اس نے دھیرے سے نینا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پلکوں پر مچلتے آنسو چپکے سے پی لیے۔ جھک کر نینا کے بالوں پر ہونٹ رکھ دیے۔

جب اسے رات کی بات یاد آئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ رخسار بھیگنے لگے۔ گالوں کی گلابی رنگت پھیکی پڑ گئی۔ آج کی شام بھی اس کے لیے انگارے لائی تھی۔ بے پناہ غم اور ٹیسیں ۔۔۔ تنہائی اور جلتے لمحات ۔۔۔ اسے نہ جانے کیوں یہ خوش فہمی ہوگئی تھی کہ شاید وہ ضرور آئیں گے اس لیے وہ پارٹی سے جلد بھاگ آئی تھی۔ اس نے جلدی جلدی سے کام ختم کیا تھا۔ اور لباس تبدیل کیے بغیر بناؤ سنگار کر کے راج کا انتظار کرنے لگی تھی ۔۔۔!

وقت ڈھلتا جارہا تھا۔ نینا کتابیں بند کر کے بستر میں جالیٹی تھی سناٹا گہرا ہوتا جارہا تھا۔ اس کے کان کار کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ کتنی ہی دیر اسی طرح گزر گئی۔ لیکن راج کو نہ آنا تھا نہ آئے اس کے دل پر مایوسی کے سائے پھیلنے لگے۔ جب اس کی امیدوں کے چراغ بجھ گئے تو اس نے ایک ایک کر کے سارے زیور اتار کر بستر پر پھینک دیے۔ پھولوں کا گجرا نوچ دیا۔ مسلے ہوئے بن کھلے پھول فریادی بن گئے۔۔۔ سوجی سوجی آنکھیں۔۔۔ سرخ ہو رہی تھیں اس نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو چونک پڑی۔ اس کے چہرے کا نقاب تو اتر چکا تھا! وہ نینا کے سامنے جانے سے گھبرائی۔ اور تیزی سے باتھ روم میں گھس گئی۔

دوسرے دن صبح اٹھتے ہی نینا نے پوچھا۔

• ممی! ڈیڈی آج بھی نہیں آئے!" اسے یوں لگا جیسے نینا نے اس کے سینے میں برچھی اتار دی تھی۔ وہ تڑپ کر رہ گئی۔ ابھی وہ کوئی جواب سوچ رہی تھی کہ نینا نے پھر پوچھا۔

• ممی! ڈیڈی دو دن سے گھر کیوں نہیں آئے۔؟"

• پہلے ناشتہ کر لو پھر باتیں کریں گے" رما نے اس کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی لیکن نینا کی آنکھوں سے آنسو ابلنے لگے۔

ممی کے بہلاوے اب بے اثر ہو گئے تھے۔ وہ سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ رما نے اسے اپنے کلیجے سے لگالیا۔ نہ جانے کیسی کیسی تدبیروں سے وہ نینا کے دل کا بوجھ ہلکا کرنے میں کامیاب ہوئی۔۔ اور کتنی خوشامدوں کے بعد وہ اسے ناشتہ کی میز پر لائی۔ آج نینا کے آنسوؤں نے اس کے روح و دل کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ اب اور نہیں سہا جاتا یہ غم۔ نہیں سہا جاتا بھگوان!! وہ تڑپ اٹھی۔ اس کے ذہن کے اندھیروں میں ماضی کے چراغ روشن ہونے لگے۔ اسے گزرا ہوا زمانہ یاد آنے لگا۔ اس کی شادی کے ابتدائی تین سال کیسی مستی و رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ راج اس پر بھنورے کی طرح منڈلایا کرتا تھا۔ دونوں نے زندگی کے سارے حسین اور شوخ رنگ اپنے بیاہتا جیون میں بھر لیے تھے۔ اس کے ذہن کے پردوں پر ماضی کی شوخ تصویریں مسکرانے لگیں۔ راج اور رما اور راج!! ایک دوسرے کے لیے۔۔۔ ایک دوسرے میں سمائے ہوئے۔

سے جھوٹ کہتا ہے کام کے بہانے اکثر گھر سے باہر رہتا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ایسا کر کے راج کی ہمت بندھا رہی ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ راج کو ایک مجرم کی حالت میں اپنے سامنے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اس کا بھرم نہیں توڑنا چاہتی تھی۔

راج نے کبھی اس کا دل نہیں دکھایا تھا۔ اس پر کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ زندگی کی ساری خوشیاں اسے دے رکھی تھیں۔ لیکن رما نے اسے کیا دیا تھا؟ اتنا پیار اور اتنا سکھ دینے والی کی ایک ہی آرزو تھی۔۔ لیکن وہ اس کی یہ آرزو بھی پوری نہیں کر سکی تھی۔ اور راج اندر ہی اندر اپنی حسرت کی آنچ سے پگھل رہا تھا۔ اس محرومی نے اس کے دل و دماغ کو مجروح کر رکھا تھا۔ اور اس زخم سے بوند بوند لہو کتنے ہی دنوں سے اس کے شعور کے دامن پر ٹپک رہا تھا۔ رما کو خوف تھا کہ اگر اس سے جھگڑا کیا تو ممکن ہے کہ وہ گھر آنا ہی چھوڑ دے اور جو کھیل اس نے چھپ کر کھیلا تھا اس کا راز افشا ہو جانے سے وہ ہمیشہ کے لیے اس سے منہ پھیر لے۔ اس کے دل میں راج کے لیے بڑی گہری محبت تھی وہ اسے مظلوم بھی سمجھتی تھی۔ وہ کسی قیمت پر راج کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ اس طرح بھی اس سے دور ہو گیا تھا۔ ان کے درمیان حالات نے ایک خلیج پیدا کر دی تھی۔ اور ننھی نینا کا آخر کیا قصور تھا؟ وہ معصوم کس جرم کی سزا بھگت رہی تھی۔ اس کا ڈیڈی اس سے کیوں چھن گیا تھا۔

نینا کو راج کا لاڈ پیار سب کچھ ملا تھا۔ انھوں نے اسے عمدہ تعلیم و تربیت غرضیکہ سب کچھ دیا تھا۔ راج بھی نینا کو بہت چاہتا تھا۔ رما سوچتی تھی کہ سب ناتوں کے باوجود نینا راج کے خون کا حصّہ نہیں تھی۔ اسی لیے۔ شاید اس بیچاری کو ڈیڈی سے دوری کا عذاب جھیلنا پڑ رہا ہے۔

راج اپنی جگہ حالات کے شکنجے میں جکڑا جا چکا ہے۔ سچ مچ باپ بن جانے کے بعد اس لڑکی کو اپنا لیا ہے کہ اپنے خون کی نشانی رہے۔

رما اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے۔ بے بس۔ چاروں طرف سے بندھنوں میں بندھی۔ زنجیروں میں جکڑی۔ کبھی کبھی بات اس کے ہونٹوں تک آ آ کر رک جاتی ہے۔ وہ اکثر فیصلہ کر لیتی ہے کہ آج وہ ضرور اس سے لڑ بیٹھے گی۔ زخموں کو نشتر لگا کر سارا مواد نکال پھینکے گی۔ لیکن ہمیشہ کی طرح اس کی زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ یہ سوچ سوچ کر کہ راج کا پیار اب دوسروں کا حصّہ بن چکا ہے۔ اس کے بدن میں انگارے دہک اٹھتے ہیں۔ وہ ناگن کی طرح بپھر اٹھتی ہے کہ اسے ڈس لے اور نفرت کا سارا

زہر اس کی رگوں میں انڈیل دے ۔۔ تاکہ وہ تڑپ اُٹھے !۔لیکن وہ کچھ نہیں کرتی! کچھ نہیں کر پاتی!!
اس کے سامنے نینا کا مستقبل آجاتا ہے۔ وہ چاہے تو آج بھی راج سے ترکِ تعلق کر سکتی ہے اس کے ماں باپ اور بھائی اتنے امیر ہیں کہ راج جیسے چار چار آدمیوں کو خرید سکتے ہیں۔لیکن وہ بھابی کو کیا منہ دکھائے گی؛ بھائی سے کیا کہے گی کہ اسی بل بوتے پہ ننھی نینا کو اپنا بنایا تھا۔ ماں باپ سے جدا کیا تھا؟!

نینا اب صرف نو برس کی تھی اور چند سال بعد اس نے کچھ پوچھا تو وہ کیا جواب دے گی؟
کیا وہ راج کو کبھی بھول پائے گی؟!۔۔۔ وہ جو اس کی زندگی کا سورج ہے؟!
نہیں نہیں! وہ راج سے کہہ دے گی کہ چاہے کچھ بھی ہو لیکن تم مجھ سے منہ نہ موڑنا۔۔۔ میں تمہارے بچے کی ماں نہ سہی، تم نینا کے پاپا تو ہو۔ اس کی لاج رکھنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت کے دھاروں میں ہم تم بہہ جائیں اور ہماری بچی کو تنکے کا سہارا بھی نہ رہے۔
رما نے چپکے سے نینا کے گالوں پر پیار کیا اور تکیے میں سر چھپا لیا۔ ساری رات خیالات کی ندی اسے بہاتی رہی۔ ساری رات وہ تنکے کی طرح اِدھر اُدھر ڈولتی رہی۔

راج اس لڑکی کو بھی اب نہیں چھوڑ سکتا تھا جس نے اسے اس کی آرزو کا ثمر دیا تھا۔۔۔ اور دوسری طرف رما اور نینا کا خیال بھی اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ اس نے کسی طرح یہ محسوس کر لیا تھا کہ رما اس کے راز سے واقف ہو چکی ہے لیکن یہ اس کی عظمت ہے کہ وہ اپنے لب سیئے بیٹھی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ رما کسی دن اس سے لڑ پڑے۔ اس کے وجود کی دھجیاں بکھیر دے اسے ریزہ ریزہ کر دے تاکہ اسے سکون مل جائے۔ اپنے گناہ کے پھندے میں پھنسا قیدی بے تاب ہو رہا تھا کہ اسے جلد سے جلد سزائے موت سنا دی جائے۔ اس مسلسل کرب اور اس پیہم عذاب سے نجات مل جائے مگر مشکل یہ تھی کہ رما کے رویّے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ حیران تھا آخر یہ کیسی چٹان ہے؟ جو ذرا بھی ہل نہیں پاتی۔ وہ جان بوجھ کر رما کے لطیف جذبات کو ٹھیس پہنچا رہا تھا، اسے دکھ دے رہا تھا کہ کسی دن یہ لاوا پھٹ پڑے۔
وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اس کی ذرا سی بھول کی سزا قدرت اتنی سخت دے گی۔ جذبات نزدیک ایک اچھے تخلیقی فن پارے کی بہار سے بڑھ کر ہے

وعدہ میرے ہم سفر

ایک کھلکھلا کر ہنستا ہوا شوخ اور معصوم چہرہ ـــ میری شادی ہو چکی ہے" ایک انکشاف،
"نہیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے" تعجب اور حیرانی ـــ
"یہ بہت پہلے ہو چکا ہے" وہ پھر ہنسی
"لیکن کب؟ ـــ کہاں؟ ـــ اور ہمیں پتہ تک نہیں اس کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔
"بچپن کی بات ہے میں صرف نو دس برس کی تھی لڑکے کی ماں کو میں اتنا پسند آئی کہ انھوں نے مجھے بے بغیر نہ چھوڑا۔ مجھے اپنی شادی کا دن ابھی یاد ہے" ہنسی کا فوارہ چھوٹا ... "لڑکا ـ میرا مطلب ہے تمہارے پتی کہاں ہیں؟ کیا کرتے ہیں"؟!
"وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ گئے ہیں۔ انجینئرنگ کر رہے ہیں" وہ ناز سے بولی
"تو کیا۔ تمہاری کوئی خط وکتابت بھی ہے؟" وہ جیسے تنکے کا سہارا ڈھونڈھ رہا تھا۔ ـــ
وہ پھر ہنس پڑی ـــ "نہیں! کچھ بھی نہیں۔ ہمارے بیچ کوئی بھی پل نہیں ہے۔ ہم ایک دوسرے کے ہو کر بھی اجنبی ہیں۔ ہم نے پھر کبھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھا ـــ اور ـــ اور ایک دوسرے کے پتی پتنی بھی ہیں، ہے نا عجیب بات؟" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ـــ جیسے یہ سب کچھ مذاق ہو۔ جیسے بچپن میں ہوئی شادی کوئی تماشہ ہو۔ اور اب جوانی کی دہلیز پر کھڑے کھڑے کسی کی راہ تکنا ـــ آنکھوں میں سہانے سہانے تتلیوں جیسے رنگین سپنے سجانا ـــ اُسے بہت اچھا لگتا ہو۔
پریم نے سوچا کہ مالتی کتنی معصوم ہے۔ کتنی بھولی۔ اُسے کیا پتہ کہ بچپن کے بیاہ کا کیا انجام ہوتا ہے

بھولی بھالی لڑکیوں کو انتظار کی آگ میں جل جل کر راکھ ہونا پڑتا ہے۔ اور جب ایک ایک سپنا ٹوٹتا ہے۔ ایک ایک آشا گھایل ہوتی ہے، تب آتما کس طرح لہولہان ہوتی ہے — دکھ کی چتا میں ستی ہو جاتی ہے۔ یا روز مر مر کر جیتی ہے — جی جی کر مرتی ہے۔

پریم اور مالتی، ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ اور اب دونوں ایک ہی ساتھ بی ایس سی کر رہے تھے۔ دونوں میں دوستی اور گہرا اعتماد بھی تھا۔ ایک ایسا انجانا اعتماد جس کی جڑیں دلوں میں اتر کر کب کی مضبوط ہو چکی تھیں۔ اس روز باتوں باتوں میں مالتی نے اپنے بیاہ کی بات بتائی تو پریم کو اپنے اندر کوئی چیز ٹوٹتی سی محسوس ہوئی تھی جیسے کانچ کی مورتی چھکے سے ٹوٹ کر بکھر گئی ہو — ریزہ ریزہ ہو گئی ہو :

چمن سے اک مورتی کہیں ٹوٹی
ہاتھ یہ کس کے تھر تھرائے ہیں

پریم نے دیکھا کہ بکھرے شیشوں کی کرچیوں میں بھی ایک ہی تصویر مسکرا رہی ہے کھلکھلا کر ہنس رہی ہے۔ مالتی کی تصویر!! اور اس کے لبوں سے ایک دبی دبی آہ نکل گئی۔ وہ جب بھی مالتی سے ملا اس کے زخمی دل پر ایک اور تازہ زخم لگا۔ ایسا لگتا وہ اپنے حال سے پوری طرح خوش ہے مطمئن ہے اُسے مستقبل کے آنے والے ہولناک دنوں کا ذرّہ بھر بھی خوف نہیں۔ کسی طوفان کا خطرہ نہیں۔ وہ حال کی پُرسکون لہروں پر دھیرے دھیرے کسی نیا کی طرح بہا جا رہی ہے۔ بہی جا رہی ہے!! پریم نے کئی بار اُسے احساس بھی دلانا چاہا۔ "مالتی! تم نے بتایا تھا نا کہ تم اور وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو کیا اُن کے گھر والے تمھیں ملنے آیا کرتے ہیں؟" مالتی کی آنکھیں پھیل گئیں جیسے ہنس رہی ہوں۔ "ارے! تمہیں اتنی فکر کیوں ہو رہی ہے بپّی!" وہ اس کے گھریلو نام سے ہی مخاطب کرتی تھی — اور پریم کو دل میں شیشے کی کرچیاں سی چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ "سچ بتاؤ — ورنہ میں تمھیں آج گھر جانے نہیں دوں گا۔"

"اچھا تو یہ دھمکی ہے؟!" ہرنی جیسی آنکھیں اس کی آنکھوں میں اترنے لگیں۔

"دھمکی نہیں پگلی! ریکوسٹ - REQUEST سمجھو۔"

"بھئی دیکھو! وہ لوگ تو میرے پپّا اور ممّی کے جان پہچان کے ہیں نا! کبھی کبھار ملنے بھی آ جاتے

پھر کتنے دن اور گزر گئے۔ دن ڈھل کر مہینے اور مہینوں نے سال کا لبادہ اوڑھ لیا جگدیش نہیں آیا۔ ہر خط میں کوئی نہ کوئی بہانہ ـــ کوئی ٹریننگ اور تب ماں باپ کو پتہ چلا کہ وہ واپس آنا نہیں چاہتا۔ اس نے اپنے خط کے ساتھ اپنی امریکن بیوی کی تصویر بھی بھیج دی تھی۔ اور یہی اس کا فیصلہ تھا جیسے آسمان ٹوٹ کر دھرتی کی کوکھ پر آگرا ہو۔ دھرتی کا سینہ اس بوجھ سے پھٹ گیا۔ پارہ پارہ ہو گیا۔ ماں کی ممتا لہولہان۔ باپ کا آدرش ٹوٹا بکھرا ـــ اور زمین بوس!! وہ لڑکی والوں سے کیا کہتے؟ آنکھیں چرانے لگے۔ بہانے اور جھوٹ کا سہارا لیا۔ آخر کب تک؟۔ ایک دن سچائی کا چہرہ بے نقاب ہو گیا اور تب مالتی نے دیکھا کہ بپا اس سے آنکھیں نہیں ملا تے ـــ ممی نے بستر کا سہارا لے لیا۔ اس کے اپنے من کی گہرائی میں سجے سنورے سپنوں کے شیش محل چھن چھن کر کے ایک ایک ٹوٹتے رہے۔ بکھرتے رہے۔ دل زخمی۔ آشا کے پانو چھلنی ہونے لگے۔ اعتماد کی دیوار ڈھے گئی۔ ریت کی مانند بکھر گئی۔ قدم لڑکھڑانے لگے۔ اب کس کا سہارا ہے؟ کس کو پکاروں کیا کروں؟ کس کا ہاتھ تھاموں۔؟ اسے اپنا وجود بھی گہرائیوں میں گرتا دلدلوں میں دھنستا محسوس ہو رہا تھا! آنے والے دنوں کی ہولناک آگ اس کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ وہ جل رہی تھی۔ بانس کے گھر کی طرح۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے زمین پر آگرے گا۔ جل جل کر راکھ ہو جائے گا۔ جل بجھے گا!

لکڑی جل کوئلہ بھئی کوئلہ جل بھئی راکھ

میں پاپن ایسی جلی کوئلہ بھئی نہ راکھ ہو

اُسے اپنی ہنسی یاد آئی۔ اپنی لاپروا مست مگن زندگی یاد آئی۔ ہرن کی طرح ڈولتی اٹھلاتی کلیوں کی طرح جھومتی مالتی یاد آئی۔ کہاں ہے وہ مالتی؟ کہاں کھوگئی ہے وہ ـــ یہ اب مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں ہنستی کیوں نہیں۔؟ میرے ہونٹ ہنسنا کیوں بھول گئے ہیں۔ کیا میں مرچکی ہوں؟ کیا میں اب صرف ایک ممی (حنوط شدہ لاش) بن کر رہ گئی ہوں۔ مجھے ٹھکرا دیا گیا ہے۔ ایک عورت ایک۔ جوانی ٹھکرائی گئی ہے۔ آج عورت کا آدرش زخمی ہے۔ جگدیش نے مالتی کو ہی نہیں بلکہ سارے مردوں نے ساری مالتیوں کو پیروں تلے روند کر ان کی نفی کر دی ہے۔ عورت کا پیار، نفرت اور حقارت کے شعلوں میں جلا دیا گیا ہے۔ پیار! جو ہر لڑکی ہر عورت پر بہار بن کر چھاتا چلا جاتا ہے۔

ہیں۔ دیوالی پر میرے لیے انھوں نے ریشمی ساڑی بھی تحفہ میں دی تھی۔ مجھے ان باتوں سے کوئی غرض نہیں تھی!" وہ لاپرواہی سے بولی

"لیکن مالتی! یہ بتاؤ ـــ وہ ـــ وہ میرا مطلب ہے کہ ان کے لڑکے سے کوئی خیر خبر نہیں آتی ؟" پریم من ہی من میں ڈرتا رہا۔

"آتی ہوگی۔ مجھے کیا معلوم" وہ لاپرواہی اپنی چوڑیوں سے کھیل رہی تھی۔

"تمھارے والدین کیا کہتے ہیں ؟"

"کیا کہیں گے۔ بس واپسی کا انتظار کر رہے ہیں کہ کب وہ آئے اور کب میرے بوجھ کو اپنے دوش سے اتار پھینکیں" پریم چپ ہوگیا۔ اب اسے کہنے کے لیے کیا رہ گیا تھا وہ تو خواہ مخواہ ہی مالتی کا پیار من میں سمائے بیٹھا تھا۔ جبکہ مالتی کو اپنے امریکن پتی کا انتظار تھا۔ مالتی ہنستی بولتی۔ بھولی بھالی سی پھولوں کی طرح خوبصورت۔ من میں کوئی کھوٹ نہیں۔ سیدھی سادی، پریم کو اتنی اچھی لگتی کہ وہ چاہتا تھا جب اپنی منزل کو پالے تو اس بے مثل چاند کی ڈولی اپنے گھر آنگن میں اتارے گا! اور من کے اُجالے کے ساتھ گھر کو بھی روشن کرلے گا۔ لیکن مالتی کے اس راز نے اُسے اُتھل پُتھل کر کے رکھ دیا تھا۔ آشا کے سارے ریشمی دھاگے الجھ گئے تھے۔ کوئی سرا ہاتھ نہ لگتا۔ وہ انھیں کیسے سلجھائے۔ جبکہ تقدیر بنانے والے نے سارے دھاگے گڈمڈ کر دیئے تھے۔ اور پھر اس کے من کو موہنے والی بھی تو اس کے دکھ سکھ سے پریم کو پہچان نہیں پائی تھی۔ اور اپنے آپ میں مست مگن رہتی تھی۔ دن رات، رات دن پت جھڑ کے پتوں کی طرح گر گر کر مٹی اور دھول میں ملتے جا رہے تھے۔ وقت کی آندھی سوکھے پتوں کے ڈھیر کو اڑائے لیے جا رہی تھی۔ جانے کہاں ؟ جانے کس کھائی میں۔۔!

پریم ایم ایس سی کر رہا تھا۔ مالتی کو پپا نے منع کر دیا تھا وہ چاہتے تھے کہ مالتی اب اپنے پتی کا گھر سنوارے۔ وہ لڑکے کے ماں باپ سے بھی ملے" بس اب دو تین مہینوں میں وہ واپس آرہا ہے۔ آتے ہی رخصتی کروالیں گے آپ چنتا نہ کریں۔ بہو ہماری ہے۔ جب چاہیں گے آکر لے جائیں گے۔ ہم نے تو جگدیش کو لکھ دیا ہے"

اور وہ مطمئن ہو کر چلے آئے تھے۔ مالتی کی کھوجتی نظریں پپا اور ممی کے چہروں کو ٹٹول کر۔ انھیں شانت اور سکھی دیکھ کر پلٹ گئیں۔ اور وہ سدا کی طرح سپنوں کی گلیوں میں کھو گئی ـــ!!

پھر کتنے دن اور گزر گئے۔ دن ڈھل کر مہینے اور مہینوں نے سال کا لبادہ اوڑھ لیا جگدیش نہیں آیا۔ ہر خط میں کوئی نہ کوئی بہانہ ــــ کوئی ٹریننگ اور تب ماں باپ کو پتہ چلا کہ وہ واپس آنا نہیں چاہتا۔ اس نے اپنے خط کے ساتھ اپنی امریکن بیوی کی تصویر بھی بھیج دی تھی۔ اور یہی اس کا فیصلہ تھا جیسے آسمان ٹوٹ کر دھرتی کی کوکھ پر آگرا ہو۔ دھرتی کا سینہ اس بوجھ سے پھٹ گیا۔ پارہ پارہ ہوگیا۔ ماں کی ممتا لہولہان۔ باپ کا آدرش ٹوٹا بکھرا ـــــ اور زمین بوس!! وہ لڑکی والوں سے کیا کہتے؟ آنکھیں چرانے لگے۔ بہانے اور جھوٹ کا سہارا لیا۔ آخر کب تک؟۔ ایک دن سچائی کا چہرہ بے نقاب ہوگیا اور تب مالتی نے دیکھا کہ پتا اس سے آنکھیں نہیں ملاتے ـــــ ممی نے بستر کا سہارا لے لیا۔ اس کے اپنے من کی گہرائی میں سجے سنورے سپنوں کے شیش محل چھن چھن کر کے ایک ایک ٹوٹتے رہے۔ بکھرتے رہے۔ دل زخمی۔ آشا کے پانو چھلنی ہونے لگے۔ اعتماد کی دیوار ڈھے گئی۔ ریت کی مانند بکھر گئی۔ قدم لڑکھڑانے لگے۔ اب کس کا سہارا ہے؟ کس کو پکاروں کیا کروں؟ کس کا ہاتھ تھاموں۔ ؟ اسے اپنا وجود بھی گہرائیوں میں گرتا دلدلوں میں دھنستا محسوس ہو رہا تھا! آنے والے دنوں کی ہولناک آگ اس کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ وہ جل رہی تھی۔ بانس کے گھر کی طرح۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے زمین پر آگرے گا۔ جل جل کر راکھ ہو جائے گا۔ جل بجھے گا!

لکڑی جل کوئلہ بھئی کوئلہ جل بھئی راکھ

میں پاپن ایسی جلی کوئلہ بھئی نہ راکھ ہو

اُسے اپنی ہنسی یاد آئی۔ اپنی لاپروا مست مگن زندگی یاد آئی۔ پون کی طرح ڈولتی اٹھلاتی کلیوں کی طرح جھومتی مالتی یاد آئی۔ کہاں ہے وہ مالتی؟ کہاں کھوگئی ہے وہ ـــ یہ اب مجھے کیا ہوگیا ہے۔ میں ہنستی کیوں نہیں۔؟ میرے ہونٹ ہنسنا کیوں بھول گئے ہیں۔ کیا میں مرچکی ہوں؟ کیا میں اب صرف ایک ممی زحنوط شدہ لاش بن کر رہ گئی ہوں۔ مجھے ٹھکرا دیا گیا ہے۔ ایک عورت ایک۔ جوانی ٹھکرائی گئی ہے۔ آج عورت کا آدرش زخمی ہے۔ جگدیش نے مالتی کو ہی نہیں بلکہ سارے مردوں نے ساری مالتیوں کو پیروں تلے روند کر اُن کی نفی کردی ہے۔ عورت کا پیار، نفرت اور حقارت کے شعلوں میں جلا دیا گیا ہے۔ پیار! جو ہر لمحہ کی ہر عورت پر بہار بن کر چھاتا چلا جاتا ہے۔

پیار جو اس کے ہونٹوں کا تبسم ہے آنکھوں کی چمک اور گالوں کی دھنک ہے۔ آج اُسے اپنے پیار کی تحقیر و تذلیل پر ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے ماتھے کی بندیا کسی نے نوچ کر پیروں تلے مسل ڈالی ہو۔ اس کی مانگ کا سیندور مٹی میں ملا دیا ہو۔ اس کا دل بھر بھر آیا۔ ایک چیخ سی اس کے ہونٹوں پر آ کر دم توڑ گئی۔ آنسو چھلک آئے لیکن اس نے ضبط کی دیواریں یوں کھڑی کر دیں کہ ایک بھی آنسو پلکوں سے ٹپک نہ پایا! اس نے اپنے آنسو اپنے من میں اُتار لیے نہیں نہیں۔ میں نہیں روؤنگی نہیں روؤنگی۔ مجھے تو ہنسنا ہے۔ میں ہنستی رہوں گی۔ میری ہنسی پر کسی کا اختیار نہیں ہے۔ نہیں ـــــ اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اور ابھی ابھی وہ ایم ایس سی کی سائنس کی کلاس اٹنڈ کر کے باہر نکلی تو سامنے ہی اُسے پریم مل گیا۔ "تم ـــ تم مالتی۔ یہاں" حیران حیران آنکھیں اپنے محبوب کو سامنے پا کر جھوم اُٹھیں جیسے پت جھڑ میں ساون آ گیا ہو۔

"ہاں پریم! میں نے داخلہ لے لیا ہے۔ ایم۔ ایس سی کرونگی۔ پھر۔ پی۔ ایچ ڈی" وہ اپنے ہاتھ میں پکڑی کتاب پر نظر جما کر بولی۔

"پھر۔" اس نے سانس روک کر پوچھا ـــ "پھر؟!" وہ مسکرانے لگی "پھر سروس کروں گی لڑکیوں کو پڑھاؤں گی۔ زندگی پتھریلی راہوں پر آگے بڑھاؤں گی ـــ یوں میری بھی زندگی بیکار تو نہ جائے گی نا ـــ!"

"مالتی! کیا کہہ رہی ہو تم۔ میں سمجھا نہیں۔ وہ۔ وہ "

"بُدّھو ـ! یہی پوچھنا چاہتے ہو نا کہ ـــــ وہ تمہارا فارن والا ہسبینڈ کیا ہوا!" وہ خوش دلی سے ہنس پڑی: "تو سنو ـــ مجھے کوئی دکھ نہیں ہُوا کہ اُس نے امریکن لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ اور وہیں پر بس گیا ہے" وہ لاپرواہی سے اپنی چوڑیاں گھما رہی تھی۔

پریم کے من میں بڑے بڑے اندیشوں کے ناگ نے پھنکارا۔ کرچیاں اُسے پھر سے لہو لہان کر گئیں: "اوہ! آئی ایم سوری مالتی۔ میں۔ میں اسی دن کے لیے ڈرتا تھا" اس کا لہجہ بڑا اداس تھا ـــــ مالتی نے عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھا!

کتنا پیارا آدمی ہے یہ پریم بھی! میرے آنے والے دنوں سے ڈرتا رہا۔ جبکہ میں خود لاپرواہی رہی ـــ اس کے لبوں پر گھائل مسکان آ گئی ـــ

"ایک بات کہوں مالتی! اگر تم برا نہ مانو ـــــ تو" پریم کا چہرہ امید کی کرنوں سے روشن تھا۔

"تمہاری بات کا برا ماننا کیا۔ کہو۔!"

"تم ۔ تم پہلے ہی ایم ایس سی کرو! ـــــ پھر پی ایچ۔ ڈی۔ پھر سروس بھی کرنا ـــــ ـــــ لیکن ـــــ جیون کی اس راہ میں۔ میں تمہارا ہم سفر رہوں گا تم تنہا نہیں رہو گی مالتی۔ تم تنہا کبھی نہیں تھیں مالتی!!" اس کی آواز تھرتھرا گئی۔

"تم ـــــ پنی ـــــ پنی! ـــــ یہ ـــــ یہ کیا کہہ رہے ہو" اس کی آواز بھرا گئی۔

"وہی جو بہت پہلے کہنا چاہتا تھا۔ وعدہ کرو کہ اب تم ـــ تم کسی کا بھی انتظار نہیں کرو گی۔ سوائے میرے ـــ!" پریم کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ آنکھوں میں آس کے دیپ جگمگا رہے تھے۔ اس نے پیار سے بھرپور نگاہوں سے مالتی کو دیکھا۔ نظریں چار ہوئیں۔ مالتی کے ہونٹوں پر کپکپاہٹ سی ابھری۔ ماتھے پر ننھی ننھی پسینے کی بوندیں جھلملائیں گالوں پر پیار کا گلال سا گھل گیا۔ کچھ دیر کی خموشی کے بعد وہ دھیرے سے سر جھکا کر بولی ـــ

"وعدہ ـــ میرے ہم سفر ـــــ!"

OO

کرب کی صلیب

مجھے نہیں معلوم دولہا کس کو کہتے ہیں، مگر سب کی زبان سے سن سن کر اتنا ضرور جان گئی ہوں کہ میرا دولہا پردیس میں ہے۔ میں نے جب سنا کہ سارے لوگ "دولہا آگیا" کی رٹ لگائے ادھر سے ادھر جھانکنے لگے تو دھکم پیل کی پروا نہ کرتے ہوئے لوگوں کے بیچ گھس کر میں نے بھی آخر دولہا کو دیکھ لیا تھا اور امّی سے پوچھ بیٹھی "کیا یہی میرا دولہا ہے؟" آس پاس کھڑے لوگ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگے۔ امّی نے مجھے بُری طرح ڈانٹا۔

"بے شرم! دولہا کا نام زبان پر لاتی ہے۔ خبردار جو دوبارہ کبھی کہا۔"

اور میرے ننھے سے دل میں دولہا کو دیکھ کر جو ایک پیاری سی عجیب سی کرن پھوٹی تھی ڈانٹ پھٹکار کے ملبے تلے دب کر بیٹھ گئی۔ ہا۔! دولہا۔!!

ابھی میرے آنکھوں کے آئینے میں جگمگ جگمگ کرتا ایک رُوپ سمایا ہوا ہے۔ سر سے پیر تک مہکتے ہوئے کئی کلیوں میں سجا۔ سر پہ زرتار صاف زربفت شیروانی، سفید چوڑی دار پاجامہ اور چمکتے جوتے! جیسے خوشبوؤں اور رنگوں کا ایک طوفان ہو۔ ہونٹوں پر شوخ تبسم۔ سُرمئی آنکھوں میں چمک۔ جیسے کچھ بھول رہی ہو۔ آج بھی بچپن میں دیکھا ہوا وہ منظر یاد آتا ہے تو ایک عجیب سا منہ بند احساس جاگ اُٹھتا ہے۔ فوراً ہی امّی کی بازگشت سنائی دیتی ہے اور میں بالکل ننھی بچّی کی طرح سہم اُٹھتی ہوں۔

کتنے دن گزر گئے، دن نہیں سال۔ سال بھی نہیں، شاید پوری عمر وہی خواب: دہا

ایک سجا دھجا روپ آنکھوں میں سماتا رہا۔ دل میں دھڑکن بن کر دھڑکتا رہا۔ ہونٹوں پر کپکپاتا رہا اور کنواری آنکھوں کی چلمنوں کے پیچھے مُسکراتا رہا۔ دولھا!

عمر بھاگتے لمحوں کے ساتھ بھاگتی جارہی ہے۔ بچپن میں دولھا دیکھنے کی اور اس کے متعلق زبان کھولنے کی تو جراُت کرلی تھی۔

مگر بچپن کے بعد یہ شوق، یہ سوال دل کے نہاں خانوں میں بند رکھا۔ اندر ہی اندر اسے دفن کرتی رہی کہ کہیں مُنہ پھٹ بن کر کچھ پوچھ نہ بیٹھوں اور اتی ڈانٹ دیں تب مجھے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ بچپن کے معصوم اور انجان لمحوں میں کسی کے دامن سے کیوں باندھ دیا تھا جب کہ مجھے اس کا نام تک معلوم نہ تھا لیکن جوں جوں بڑی ہوتی گئی رفتہ رفتہ یہ پتہ چل گیا کہ مجھے اپنے دادا مرحوم کی اُکھڑتی سانسوں کی بھینٹ قربان کیا گیا تھا کہ ان کی رُوح کو تسکین ملے اور وہ ساتھ کوئی حسرت لے کر نہ جائیں۔ میں تب کوئی پانچ سال کی گڑیا تھی جبکہ دادا اَبّا کے دوست کے بیٹے سے میرا نکاح پڑھوا دیا گیا تھا۔ میری دائی ماں کہتی ہے کہ بیٹا تجھے گڑیا گڈّا بھی کھیلنا نہ آتا تھا۔ جب دُلہن بنایا تھا۔ ہاں تجھے لال جوڑا پہنا کر زیور اور پھولوں سے سجایا سنوارا تھا اور اکرم میاں کوئی آٹھ سال کے تھے۔ ان کو بھی زرتار لباس اور پھولوں کے ہار گجرے پہنائے اور باقاعدہ تیرا نکاح ہوا تھا۔ احباب کی ضیافت ہوئی۔ ہاں رُخصتی نہیں کی۔ اس کے لیے یہ طے کیا گیا کہ جب تو بڑی ہو جائے گی اور اکرم میاں پڑھ لکھ کر لائق ہو جائیں گے تب رُخصتی کریں گے۔ یوں تیرے دادا چند گھنٹوں بعد خدا سے جا ملے، جیسے تیرا فرض پورا کرنے ہی میں جان اٹکی تھی۔

اور میں سُن سی بیٹھی پھٹی آنکھوں سے بچپن کے اس منظر کے ٹکڑے جمع کر کے مجسّم دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ دائی ماں کہتی جاتی ــــ

"پھر بیٹا! وہ لوگ تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے۔ برسوں کسی کی خبر نہ ملی پھر بہت دن بعد پتہ چلا کہ وہ پاکستان میں ہیں۔ جلد ہی حالات ٹھیک ہونے پر تمھیں لینے بھی آئیں گے۔"

دائی ماں مجھے ماں سے بڑھ کر لگتیں جس نے کم از کم مجھے اس بات سے آگاہ تو کر دیا کہ کیسے اور کیوں مجھے سولی پر چڑھایا گیا تھا، ورنہ برسوں صلیب پر ٹنگی رہ کر بھی مجھے یہ پتا

تک نہیں چلتا کہ میں یہاں کس لیے مضطرب ہوں! اب اتنا تو جان گئی تھی کہ چند دقیانوسی خیالات کے لوگوں کی بے معنی اور ناقابل فہم رسم و رواج کی بنا پر ایک ننھا سا وجود زندہ درگور کر دیا ہے۔ وہ وجود آج بڑھ کر او نچا اور پدری زندگی کی حرارت سے تڑپتا ہوا جوانی کا ایک مرقع بن گیا ہے۔ پھر دائی ماں حق سے جا ملیں اور بٹیا کی رخصتی کا ارمان لیتی گئیں۔ میں بہت دن روئی۔ ایک ہمدرد، غم گسار مجھ سے جدا ہو گیا تھا۔ امی سے لڑ جھگڑ کر میں نے بی۔ایس۔سی کے بعد ایم۔ایس۔سی میں داخلہ لے لیا۔ ابا جی کو اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ ہم کیا کر رہے ہیں ——— انھیں تو بس شکار کی لت تھی۔ دوست احباب کو دعوتیں دینے کا جنون تھا، مہینوں گھر سے باہر رہتے شکار کے لیے ہزاروں روپیہ خرچ کر ڈالتے اور ہفتوں جنگل میں ڈیرا ڈالے مزے اڑاتے۔ میں بڑی لڑکی ہوں۔ نشو چھوٹی ہے۔ ابھی میرا فرض ہی پورا نہ ہوا تو نشو کا کب ہوگا۔ نشو بھی میرے قدم سے قدم ملا کر چلنے کو تیار کھڑی ہے۔ میں یونیورسٹی کی ذہین طالبہ ہوں۔ اپنے آپ پر ناز بھی کر سکتی ہوں کہ قدرت نے ایک حسین ترین وجود میں مجھے ڈھالا ہے۔

شاید اسی خوش فہمی میں مبتلا ہو کر میں کچھ خود سر اور خود دار بھی واقع ہوئی ہوں۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ کسی کو لفٹ نہیں دیتی۔ نوجوان لڑکے مجھ سے ہنس بول لینے کو ایمان سمجھتے ہیں۔ میں ان سے بات چیت صرف اس حد تک ہی رکھتی ہوں کہ وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ سہیل یونس، اکرم ـ یہ سب ہی ایم۔ایس۔سی کے ذہین اور سمارٹ طلباء ہیں۔ مجھ سے بڑے مخلص بھی ہیں۔ میں ان میں سے کسی ایک کو بھی دل کے سنگھاسن پر بٹھا نہیں پاتی۔ کسی کی معنی خیز مسکراہٹ کا جواب مسکرا کر نہیں دے سکتی۔

اس لمحے شاید کہیں دور ذہن و دل کی اتھاہ گہرائیوں میں کوئی یاد جاگ اٹھتی ہے کہ میں کسی کی امانت ہوں۔ میرا پیار، میری توجہ کسی اور کے لیے ہے۔ وہ جو میرا دولھا ہے، اور تب میں ایک شانِ بے نیازی سے گزر جاتی ہوں۔ اعتماد کی ریشمی ڈور میں بندھی بندھی کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہوں کہ پتہ بھی نہیں چلتا۔

عمر بند مٹھی سے پھسلتی ریت کے مانند بکھرتی چلی جا رہی ہے۔ جوانی کے گلابی لمحوں میں اس کا احساس بھی نہ ہوا کہ واقعی عمر ڈھل رہی ہے۔ ابا جی کی زندگی میں کچھ رشتے میرے لیے ضرور آئے

عمدہ اور طرح دار.... انھوں نے امّی کو سمجھایا کہ بیگم کب تک راہ دیکھیں گے.... کسی کے گھر اس کی ڈولی اُتارنی ہی ہے۔ چلو اُن میں سے کسی کو منتخب کرلیں" لیکن امّی کو جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ وہ بُری طرح چیخیں چلّائیں کہ توبہ میرے آگے پھر یہ بات نہ کرنا۔ شمّی کسی کی امانت ہے۔ اس کا دولہا سلامت ہے وہ آئے اور لے جائے۔ کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ منکوحہ لڑکی کو دوبارہ بیاہ دیں۔ یوں شیروں کی گرج پہ نڈر ہو کر گولی چلا دینے والے ابّا جی بیوی کے آگے نرم پڑ جاتے اور بات ٹل جاتی۔ وقت کی لگام کس نے تھامی ہے۔ ابّا جی شکار، دوستوں اور دعوتوں سے تھک کر ابدی نیند سو گئے۔

امّی کو ذرا ہوش آیا۔ میجر شاہد کا رشتہ نشو کے لیے طے کر دیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس شاک سے سنبھلتی وہ دُلہن بنا دی گئی، اور میرے سامنے میری چھوٹی بہن اپنے دولھا کا ہاتھ تھام کر روتی، سسکتی سسرال چلی گئی اور مجھے تب ہوش آیا جب ساری گہما گہمی ختم ہو چکی تھی اور میرے سامنے طویل جلتی شاہراہیں اپنی باہیں پسارے کھڑی ہیں۔ یوں تو میں اپنی سروس پر لگ چکی ہوں، ماہانہ ایک ہزار روپے تک کما لیتی ہوں۔

لیکن زندگی اور کچھ تو مانگتی ہے۔ احباب کی چبھتی ہوئی طنزیہ نگاہوں سے فرار حاصل کر کے میں امّی کو لے کر دور اس شہر میں آگئی ہوں، جہاں لڑکیوں کے کالج میں میرا تبادلہ ہوا ہے۔ سارا دن مصروف رہتی ہوں۔ رات کو بھی نیند آنے تک کتابوں میں کھوئی ہوئی اپنے ذہن و دل کو بھٹکنے سے روکتی ہوں لیکن شاید امّی کو میری بے کسی کا احساس اب ستانے لگا ہے۔ وہ بیمار رہنے لگی ہے۔ میرے دل کے اندھیرے ان کی آنکھوں میں اُتر آئے ہیں۔

ان ہی دنوں ہماری ملاقات ایک اچھے خاندان سے ہوگئی ہے جو ہمارے پڑوسی ہیں امّی کی آنٹی سے دوستی ہوگئی۔ انھوں نے اپنے لڑکے ڈاکٹر عدنان کے لیے میرا رشتہ مانگا ہے، جو مڈل ایسٹ میں دس بارہ ہزار کما رہا ہے۔ میری آنکھوں میں اَدھ کھلے کنول جھومنے لگے۔ دل بات بات پر کسی خوب صورت دُھن کی طرح دھک دھک کرنے لگا ہے۔ سپنوں کی گلیوں میں دیوالی کے دیے جگمگ جگمگ کرنے لگے ہیں۔ جن کی ننھی پیاری پیاری روشنی میرے

مَن کے آنگن میں اُجالا بکھرنے لگی ہے اور میں گنگناتی 'جھومتی' بہاروں کی شاخ گل سی بن جاتی ہوں کہ میرے آنگن برات اترنے کو ہے۔ مُنہ بند آشائیں اب کھِلنے کو ہیں۔

آنٹی نے چپکے سے مجھے عدنان کی فوٹو دکھادی تھی "شنی! دیکھ یہ تیرا دولہا ہے' جیسا نام ویسا ہی انسان ہے۔ ہے نا؟ اتنا شاندار۔ اتنا اسمارٹ کہ بس دل دھک سے ہوگیا۔ تصویر کی آنکھوں میں مجھے وہی شوخی' وہی مسکراہٹ نظر آئی جو بچپن میں کہیں دیکھی تھی!

ایک پَل کو میں کھوسی گئی۔ تب آنٹی نے پوچھ ہی لیا۔"پسند آیا نا! ہے نا تیرے قابل!؟ ارے تُو تو ایسے شرما رہی ہے جیسے کوئی گنوار لڑکی۔"

میں واقعی بُری طرح شرما گئی تھی۔ انھوں نے میرا ماتھا چوم لیا اور کہا۔

"بیٹی! میں جانتی ہوں کہ تو انکار نہ کرے گی۔ عدنان بڑا پیارا انسان ہے وہ تیری قدر کرے گا اور تجھے خوش رکھے گا' تیری امّی نے بھی ہاں کردی ہے۔!!"

اور میرے کانوں میں کسی نے سرگوشی کی — "دولہا —"

اور کچھ دن بعد عدنان آگئے۔ دراز قامت' وجیہہ اور خوش اخلاق.....

"ہلو! — کیا آپ آسمانوں کی شہزادی ہیں؟" انھوں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ مجھ سے فوراً ہی کوئی جواب نہ بن پڑا تو دوسرا تیر پھینکا۔

"آپ کی آسمانی زبان کون سی ہے؟"

اور میں سنبھل کر بولی "جو دیوں کی ہوتی ہے۔" اور عدنان حیران حیران سا بڑی بڑی بولتی آنکھوں سے مسکرا کر یوں دیکھ رہے تھے جیسے کوئی اچنبھا ہوگیا ہو۔ پھر بڑے پیار سے میرا ہاتھ تھام کر ہونٹوں تک لے گئے اور مہرِ محبت ثبت کردی — "مجھے ساری عمر آپ کی ہی تلاش رہی۔ کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا — شکر خدا کا کہ آج تلاش ختم ہوئی۔"

اور میرا دل کامیابیوں کے ہنڈولوں میں آسمانوں کو چھو آیا۔ میری پلکیں بھیگنے' لب کپکپانے لگے۔ میں اتنا ہی کہہ پائی —

"کہیں آپ کو خوش فہمی نہ ہو؟"

"نہیں' ایسا نہ کہیئے۔ منزلیں جب ملتی ہیں تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ آپ میری منزل

ہیں، اور اب میں کبھی بھی بھٹک نہیں سکتا۔"
اور میں نے اپنی منزل کے شانے پر سر ٹیک دیا۔!

اس رات میرا بستر چیونٹیوں سے بھر گیا۔ نظر نہ آنے والی چیونٹیاں جو روم روم کو ڈسے جا رہی تھیں۔ میں ساری رات کروٹیں بدلتی رہی۔ ایک احساسِ جرم سا تھا۔ یہ میں کیا کر رہی ہوں۔ عدنان کی شخصیت کے سحر میں ڈوب کر کسی کی امانت میں خیانت کر رہی ہوں ــــ میں کسی کی منکوحہ ہوں ــــ مجھے اتنا بے قابو نہیں ہونا چاہیے......

لیکن کب تک؟ وہ میرا امین ہے کہاں ــ؟ وہ میرا ہاتھ تھامنے آتا کیوں نہیں۔ میں کب تک اس کی راہ تکوں؟ وہ جس کا پتا نہیں ہے۔ کیا اس کے نام پر یہ زندگی کاٹ دوں! میں یہ سزا کیوں بھگتوں، جبکہ جرم میں نے نہیں کیا۔ اُف! میں کیا کروں؟ رات میرے لیے صلیب سے کم نہ تھی۔

صبح میری آنکھیں سُوجی سُوجی تھیں۔ امی بھی مجھ سے آنکھیں چُراتی رہیں ــــ وہ بھی تو اس جرم میں شریک ہیں، جس کی سزا مجھے مل رہی ہے۔ میں جو صلیب پر لٹکی زندگی اور موت سے اُلجھ رہی ہوں۔ وقت اور مجبوری نے امی کو عاجز بنا دیا ہے۔ میں انھیں دُکھ بھی تو نہیں دے سکتی۔

میرا رشتہ عدنان سے پکا ہو چکا ہے۔ بیاہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ آنٹی اور امی چاہتی ہیں کہ ہفتہ بھر بعد ہی بیاہ کر دیں، تاکہ عدنان مجھے لے کر سیر و تفریح کر سکیں اور اگلے ماہ انھیں واپس جانا ہے۔

اس شام میں نے عدنان کے نام ایک رقعہ لکھا اور چپکے سے انھیں بھجوا دیا۔ رات بھر اپنے ہی ہاتھوں ٹوٹے ہوئے آئینوں کو جوڑنے کی کوشش کرتی رہی۔ بکھرے موتی سمیٹتی رہی۔ یہ جانتے ہوئے کہ مالا ٹوٹ گئی۔ اب پھر بن نہ پائے گی۔ صبح کی پہلی کرن میری آنکھوں میں کانچ کی

طرح چبھنے لگی۔ میں صبح کے نُور سے آنکھیں چرانے لگی کہ اب زندگی اندھیروں کی گپھاؤں میں روپوش ہونے کو ہے۔ دل ایک اُجڑے مندر کی طرح ویران ہے۔ ہوا سائیں سائیں چل رہی ہے۔ سارے دیپ جھلملا کر بجھ گئے ہیں۔ اب کس کا انتظار ہے۔ اب کون آئے گا۔؟

تب بہاروں کی چال چلتے عدنان اداس اور بھیگی آنکھیں لیے میرے کمرے میں چلے آئے۔ میں نظریں جھکانے لگی ہوں کیسے بلاؤں ؟

"آپ واقعی آسمانوں کی شہزادی ہیں۔ میں نے ٹھیک کہا تھا۔"

میرا دل دھڑکنیں بھول رہا ہے۔ میں چپ ہوں۔

"آپ واقعی اتنی ہی بلند ہیں کہ میں آپ کو چھو نہیں سکتا۔! ہاں شمی! آپ نے یہ رقعہ لکھ کر اپنے بچپن کے ایک راز سے پردہ اٹھا کر مجھے حیران کر دیا ہے۔ میں رات بھر سو نہ سکا۔ ہاں واقعی"

میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔

عدنان نے پھر کہا لیکن نئے انداز میں "تم۔۔ تم۔۔ کتنی بلند کردار ہو۔ ساری زندگی ایثار کیا۔ اور جب کہ سہاگ کی مہندی رچانے والی ہو تو چاہتی ہو کہ ارمانوں کے خون سے ہتھیلیاں لال کر لو۔ چاہتی ہو کہ میں تم سے بیاہ نہ کروں لوٹ جاؤں ؟"

"عدنان ۔۔" میرے بھرے گلے سے اتنا ہی نکل سکا۔

"نہیں شمی! میں تمھیں تنہا اُداس اور فرسودہ رسم کی بھینٹ نہ چڑھنے دوں گا، جو بزرگوں نے اپنی خوشی کے لیے کی تھی۔ میں تم ہی سے بیاہ کروں گا شمی! تم میری ہو۔ میری ہی رہو گی!"

اور میرے ڈگمگاتے قدموں کو عدنان نے سنبھال لیا ہے۔ تب آنٹی نے بتایا کہ عدنان ان کے بھائی انوارالحق کا لڑکا ہے جو پاکستان ہجرت کرنے کے بعد گزر گئے۔ ماں بھی نہ رہیں تو آنٹی نے انھیں اپنے پاس بلا لیا۔ تعلیم دلائی اور اب وہ مڈل ایسٹ میں مقیم ہیں۔ اُنّی نے ہی سسکیوں کے بیچ انھیں ساری کہانی سنا دی جیسے وہ کوئی الف لیلوی داستان ہو۔ عدنان ہی اکرم عدنان ہیں۔"

آنسوؤں بھری آنکھوں سے میں نے انھیں دیکھا۔ وہ مجھے ویسے ہی نظر آئے۔ دراز قامت، شوخ مچلوں میں لپٹے۔ بچپن کی ایک برات کے دولھا۔۔۔ اور میں۔۔ میری آنکھوں سے چھم چھم آنسو برسنے لگے۔

OO

ریت کی دِیوار

"انو! آج میں نے اپنے نئے سپرنٹنڈنٹ مسٹر مہتہ کو کھانے پر مدعو کیا ہے۔ بارہ بجے تک انتظام کر سکوں گی؟" وہ ٹائی کی گرہ باندھتے ہوئے بولا۔

انو رادھا کافی میں چینی ملاتے ہوئے رک کر بولی "کوشش کرونگی۔ کیا کیا ڈش چاہئے؟" روی نے اس کی جانب پیار بھری نظروں سے دیکھا "بھئی! اب یہ تمہاری مرضی۔ تم تو ایکسپرٹ ہو نا پکوان میں... ویسے ذرا اسپیشل ڈش ہو تو اچھا رہے گا۔ ایک میٹھی ڈش بھی بنا دینا۔" انو نے کافی کا پیالہ آگے بڑھا دیا "خوشامد کرنا کوئی تم سے سیکھے۔ پہلے تعریف کے پُل باندھتے ہو پھر فرمائش کے۔"

وہ مسکرانے لگا "اچھا! تم سامان کی لسٹ بنا دو کسی کے ہاتھ بھجوا دونگا" اُس نے جلدی جلدی گھونٹ بھرے۔ انو نے اسکوٹر کے باکس میں تھیلا رکھ دیا۔ اور سلیپ پکڑاتے ہوئے بولی "نو بج رہے ہیں۔ جلدی سے سامان بھجوا دینا!"

"انو ڈارلنگ! ٹھیک بارہ بجے مسٹر مہتہ کو لے کر آ جاؤنگا۔ سارا انتظام مکمل رہے۔ اور ہاں سنو! رانی جی آپ بھی ذرا ٹیپ ٹاپ رہیں۔ بے بی کو بیڈ روم میں دے دو۔ وہ کچھ دیر سنبھال لیں گے۔"

وہ بناوٹی غصے سے بولی "ہاں! اُنہے دن دعوتیں سوجھتی ہیں۔ کیا فائدہ ہو رہا ہے؟ یہی نا کہ ہر مہینے خرچ بڑھ جاتا ہے۔ ایک نوکر تک کا انتظام نہیں ہو سکتا۔"

"گھبراؤ نہیں انورا! اب سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ کوارٹر بھی مل جائے گا۔ اللہ نوکر جا کر بھی نئے ذرا اس نئے آفیسر کو خوش کر دیں پھر دیکھنا"۔ وہ مسکرانے لگی۔ روی اسکوٹر اسٹارٹ کر چکا تھا۔ بے بی ڈگمگاتے قدموں سے دروازے پر آگئی۔ "تاتا۔ تاتا!" اُس نے اپنا ننھا سا ہاتھ ہلایا۔ "ٹاٹا۔ بائی!" وہ ہنستا ہوا آگے نکل گیا۔

انورادھا بے بی کو تیار کرکے پڑوس والی آنٹی کے پاس چھوڑ آئی۔ دریچے اور دروازوں کے پردے بدلے۔ فرنیچر پونچھا۔ گلدان میں تازہ پھول سجائے۔ اللہ ننھے سے مرادآبادی گلدان میں رکھی امربیل کا پانی بدلتے ہوئے اک پل کو زیرِ لب مسکرائی... وہاں ننھی منی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ ایک خیال سورج کی کرن کی طرح چمکا۔ شاید سچ کہتے ہیں کہ جہاں امربیل اچھی طرح پھولے وہاں روپئے پیسے کی ریل پیل ہوتی ہے۔ تو اب ہماری الجھنیں بھی ختم ہونے کو ہیں جب سے روی کا تبادلہ اس جگہ ہوا تھا۔ زندگی پر پریشانیوں کے گہرے بادل گھر آئے تھے۔ ابھی تک کوارٹر بھی نہیں ملا تھا اور نہ کوئی نوکر ہی۔ وہ اس چھوٹے سے کرایے کے مکان میں رہ رہے تھے جہاں کوئی سہولت نہ تھی وہ جب بھی گلہ کرتی۔ روی اُسے تسلی دلا دیتا "بھئی اب چند دنوں کی تو بات ہے۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا"۔

اور آج ایک نئی اُمنگ کے ساتھ اُس نے سارا انتظام کیا۔ ڈنر ٹیبل سجا کر ہاتھ منہ دھوئے اور ہلکی سی آسمانی شیفون کی ساڑی پہن کر بے بی کو لے آئی۔

"اوہنہ! بے بی کو سنبھالنے کے لیے بھی کوئی آیا نہیں رکھ سکتے"۔ اُس نے دل ہی دل میں بڑبڑاتے ہوئے دودھ کی بوتل بے بی کے منہ سے لگادی۔ تب ہی جیپ کا ہارن گونج اٹھا۔ دوسرے لمحے برآمدے میں قدموں کی چاپ اور آوازیں سنائی دیں۔

"انو۔ ارے بھئی! کہاں ہو؟" روی سیدھے بیڈ روم میں چلا آیا۔

"آ گئے؟" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں! کھانا تیار ہے؟" وہ جوتے نکالتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی"۔

"گڈ! اسی ادا نے تو مارا ہے ڈارلنگ! اچھا چلو مسٹر مہتہ سے ملواؤں پھر کھانا پروس دینا"۔

"خواہ مخواہ میں کیوں ملوں کسی سے!!" وہ منہ بنا کر بولی۔

"بس! اسی کا نام اطلاق ہے! چلو۔ اس میں بُرائی بھی کیا ہے۔" اُس نے ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ اور وہ روی کے پیچھے سر پر آنچل جمائے برآمدے میں چلی آئی۔ نمستے کہتے ہوئے جوں ہی اس کی نظریں اُٹھیں۔ سامنے اشوک بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ "ہلو۔ کیسی ہو؟"

"ارے۔ آپ۔ آپ کب آئے؟" وہ بوکھلائی۔

"تم جب دیکھ رہی ہو۔" اشوک کے لبوں پر شوخ مسکان تھی،

"دیدی نہیں آئی! اور آپ نے اطلاع بھی نہیں دی۔"

"روی تو جانتا تھا!" ۔۔ اور اُس نے حیرت سے روی کی جانب دیکھا وہ اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ "بھئی دراصل۔ ہم دونوں چاہتے تھے کہ آج تمہیں ذرا سرپرائز کریں گے۔ اس طرح کسی کو اچانک دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے نا!؟"

"اوہ!" اس کے لب کپکپائے۔ اُس کے چہرے پر جانے کونسا رنگ چھلک آیا۔

"اور۔ انو! آج کی دعوت مسٹر اشوک مہتہ ہی کے اعزاز میں ہے۔"

روی گمبھیرتا سے بولا۔ اور اشوک اپنی مخصوص گونجیلی ہنسی ہنس پڑا۔ "تمہیں ضرور دکھ ہوگا کہ اتنی تکلیف بیکار ہی اُٹھائی۔ کیوں!؟" اس نے ایک نظر روی پر دوسری اشوک پر ڈالی اور خفگی سے بولی۔۔۔ "اچھا تو دونوں کی ملی جلی اسکیم ہے۔۔ آج دونوں کو کھانا نہیں ملے گا سزا کے طور پر۔" ۔۔۔"آؤ اشوک! تمہارا ہی گھر ہے۔ خود بھی نکال کر کھا سکتے ہو۔۔"

روی ہنستا ہوا اندر چلا گیا۔ انورادھا کے قدم جہاں کے تہاں جم گئے۔

"میرے آنے سے تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟" اشوک نے پوچھا۔ اور وہ دھیمی ہنسی ہنس پڑی۔ "بھلا یہ بھی کوئی سوال ہے!!" اور تیزی سے اندر چلی گئی۔۔

رات بستر پر لیٹے لیٹے روی بولا۔ "تم نے اشوک کو گھر پر ٹھہرنے کو نہیں کہا۔ کیوں؟" وہ پاس ہی بے بی کو تھپک کر سلا رہی تھی۔ چونکی۔ ایک پل کو چہرے کا رنگ بدلا۔ دھیرے سے بولی۔ "نہیں کہا۔ کیوں!؟"

"اس لیے کہ پہلی بار ہمارے گھر پر آیا ہے۔ اور تم نے اُسے ٹھہرنے تک کو نہیں کہا۔ کیا سوچا ہوگا اُس نے!؟"

"کچھ نہیں سوچیں گے۔ کیا انھوں نے اتنا چھوٹا سا مکان دیکھ کر اندازہ نہیں لگایا ہوگا؟"
"پھر بھی ڈیر، ایسی گیسٹ کس کو کہتے ہیں۔ وہ یہاں "ٹی۔ بی" میں ٹھہرا ہوا ہے نیا شہر نئی جگہ۔ ایسے میں ہم یہاں رہتے ہوئے ..... ؟"
"تم ہی کہہ دیتے!"
"میں نے کہا ضرور تھا۔ لیکن وہ نہیں مانا!"
"اچھا کیا۔۔!" اس نے مختصر سا جواب دیا اور تکیے سے سر لگا دیا۔ روی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "خفا ہو ڈارلنگ!!؟"

اس نے روی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور مسکرائی "نہیں ڈیر! بھلا اپنے دیوتا سے خفا ہو سکتی ہوں۔" اور یہ کہتے ہوئے روی کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔

اشوک کبھی کبھی روی کے ساتھ گھر چلا آتا۔ روی اس کی بہت خاطر تواضع کیا کرتا۔ دونوں میں بڑی بے تکلفی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے بہترین دوست تھے۔ اتنے دنوں وطن سے دور رہا اور جب بھی سال میں ایک دو بار سسرال جاتا تو وہاں اشوک سے ملاقات ہو جاتی۔ رات گئے تک باتیں کرتے۔ تاش کی بازیاں لگتیں۔ سگریٹ پھونکتے اور قہقہے لگتے۔ اور اب اچانک اشوک اس کا سپرنٹنڈنٹ بن کر یہاں آ گیا تو روی کی خوشی کی انتہا نہ رہی! اس کی میزبانی کا یہ پہلا موقع تھا وہ کوئی کسر نہ چھوڑنا چاہتا تھا۔ انو سے اشوک کے پسندیدہ کھانے تیار کرواتا اور اصرار کر کر کے کھلاتا "بھئی ہماری انو رانی بہترین کھانے بناتی ہیں۔ شاید ہی دیدی نے کبھی ایسا کھانا تمھیں کھلایا ہو۔" اور اشوک کے چہرے پر سایہ سا گزر جاتا۔ وہ زوردار قہقہہ لگاتا "خوب کہی تم نے! بھلا شیلا کیا جانے گھر گرستی ۔۔۔ اور وہ بھی کچن میں جاتے ہوئے اس کا دم نکلتا ہے۔" اشوک یہاں آ کر محسوس کر رہا تھا کہ جیسے کسی بھولی بسری جنت میں آ گیا ہو۔

اس روز اشوک نے بے بی کے سامنے کھلونوں اور کپڑوں کے پیکٹ ڈال دیے وہ انکل انکل کی رٹ لگا رہی تھی۔ انو رادھا چائے کی ٹرے لے کر اندر آئی اور ٹھٹھک گئی ۔۔۔ اس کی آنکھوں میں ایک کرن سی لہرائی۔ دوسرے ہی لمحے وہاں کوئی سیاہ بادل سا چھا گیا۔

سرِشام دونوں مکان دیکھنے گئے۔ کمپونڈ میں قدم رکھتے ہوئے وہ پُرشوق نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی جہاں جا بجا پھولوں کے تختے تھے۔ اُس کے دل میں پھلجڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔ اس نے ایک ایک کمرہ گھوم کر دیکھا۔ "بہت شاندار ہے۔ مگر" وہ کچھ کہتے کہتے روی کی جانب دیکھ کر رک گئی۔ وہ اُسے دکھ دینا نہیں چاہتی تھی۔ "مگر کیا۔ کہو۔ کہو۔" وہ پاس آگیا۔ "یہی کہ یہاں سجانے کے لیے کافی فرنیچر چاہیئے۔" وہ اداس ہو گئی۔

"وہ بھی آجائے گا۔ فکر نہ کرو۔ بھگوان جب دینے پر آتا ہے تو دل کھول کر دیتا ہے انو ڈیر۔!" روی نے محبت پاش نظروں سے اس کی جانب تاکا۔ اور وہ اپنے دیوتا کو عقیدت بھری نظروں سے دل ہی دل میں پھول چڑھانے لگی۔ جس کے ساتھ وہ زندگی کے پانچ بہترین سال بڑی سکھ شانتی سے گزار چکی تھی۔ اس کی آنکھیں آپ ہی آپ چھلک آئیں! باہر شام کا سُرمئی آنچل فضاؤں پر مسلط ہو رہا تھا۔! اور پھولوں کی خوشبو چکراتی پھر رہی تھی۔ روی اور انو اپنے اپنے خیالات کی قوسِ قزح میں رنگے ہوئے تھے کہ بے بی نے انھیں چونکا دیا۔ "ممی! مجھے پھول تا ہیئے۔ لال پھول۔"

وہ فروری کی ایک حسین شام تھی۔ ہلکی ہلکی دھوپ جا بجا پیڑوں سے چھن چھن کر گر رہی تھی۔ فضاؤں میں خنکی اور گرمی کا حسین سا امتزاج تھا! ذہن و دل میں عجیب سی مسرت ہلکورے لے رہی تھی۔ آج روی نے پکچر کا پروگرام طے کر رکھا تھا۔! انو گنگناتی ہوئی تیار ہو رہی تھی۔ بس اب آتے ہی ہونگے۔۔! اور وہ یہ دیکھ کر گم صُم کھڑی رہ گئی کہ اُسے لینے اشوک جیپ لے آیا ہے! "ہلو۔ کیا تم تیار ہو۔؟"

وہ تعجب سے اُسے دیکھنے لگی "ہاں مگر۔ روی کہاں ہے"

"وہ پکچر ہاؤز پہنچ جائے گا۔ چلو ہم چلیں۔۔ بے بی کدھر ہے" وہ بے بی کو آواز دیتا ہوا بیڈ روم کے دروازے تک چلا آیا تھا۔ انو رادھا چپ چاپ کھڑی اُسے عجیب نظروں سے تک رہی تھی۔ وہ ٹھٹھک کر پلٹ آیا "کیا تمھیں۔ میرے ساتھ چلنا پسند نہیں؟" دل کی عمیق پہنائیوں میں ایک طوفان سا اُٹھا۔ ایک بجلی سی کوندی۔ وہ اشوک سے نظریں چار نہ کر سکی۔ پلکیں جھکا لیں۔

"اگر تمہیں مجھ پر اتنا بھی اعتماد نہیں تو کہہ دو۔ میں چلا جاؤں گا" اشوک کی آواز میں تڑپ

تی۔ انورادھا کا دل ہولے ہولے کانپتا رہا۔ وہ کشمکش میں ڈولتی رہی۔ اشوک کو واپس کر دے یا اُس کے ساتھ چلی جائے؟۔۔۔ روی کیا کہے گا؟۔۔ خود اشوک! کیا اُسے اشوک پر اعتماد نہیں رہا! کہیں دور جیسے کانچ کی مورتی چھن سے گری اور ریزہ ریزہ ہوگئی۔ وہ بیکل ہو اٹھی اور موم کی طرح پگھل گئی۔ قطرہ قطرہ بہہ نکلی۔

اشوک اُسے تکتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں کیا کچھ نہ تھا! انورادھا کچھ کہے بنا باہر نکل کر چپ چاپ جیپ میں بیٹھ گئی۔ اُس نے درمیان میں بچی کو بٹھا دیا تھا۔ !راستہ بھر اشوک سگریٹ پھونکتا رہا۔ دونوں چپ تھے جیسے دو پتھر کی مورتیاں ۔۔! اشوک کے ذہن میں جانے کیا تھا۔ جانے کونسی بھولی بسری یادیں جادو جگا رہی تھیں۔ انورادھا کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا وجود بکھرنے لگا ہے۔ تنکوں کی طرح ــــــ ...!

اشوک نے پہلے سے سیٹیں ریزرو کروالی تھیں۔ روی چند لمحوں کی تاخیر سے پہنچا انورادھا چپ چاپ سی کھوئی کھوئی سی رہی۔ فلم کے دوران بھی وہ کچھ نہ بولی۔ وہ اشوک سے آنکھیں ملانے سے کترا رہی تھی اور روی سے بھی سہمی جا رہی تھی!!

واپسی پر "ڈی لکس" میں اشوک نے شاندار دعوت دی۔ دونوں دوست خوش دلی سے ہنستے بولتے رہے۔ مگر خود وہ اپنے بکھرتے وجود کو سمیٹنے کی ناکام سعی کرتے ہوئے پھیکی ہنسی ہنستی رہی۔ بے بی اشوک کے پاس ہی تھی۔ وہ اس کے شانے پر سوگئی تھی۔

انورادھا نے کہا "لائیے۔ مجھے دیدیجئے" اُسے اپنی آواز کی اجنبیت پر ذرا بھی تعجب نہ ہوا "اسے کوئی تکلیف ہے میرے پاس؟" اشوک نے چبھتا ہوا سوال کر دیا۔ جیسے اس کی رگوں میں خون کی بجائے زہر دوڑا دیا ہو۔ وہ تھکی تھکی سی اپنی کرسی میں دھنس گئی۔ اور اپنے آپ پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ بھی روی اور اشوک کے ساتھ گفتگو میں حصہ لینے لگی۔ اشوک کے ہونٹوں پر لازوال تبسم رقص کرنے لگا۔

رات گئے انہیں رخصت کرتے ہوئے اشوک کہہ رہا تھا "تھینکس اے لاٹ فار دی سوئٹ کمپنی ۔!" وہ جواب دیے بغیر ڈگمگاتے قدموں سے اندر چلی گئی۔ اس کے کانوں میں اشوک کی آوازیں ٹکراتی رہیں۔ سگریٹ کی مدہوش کن مہک اور چبھتی ہوئی درد بھری آنکھیں

[illegible]

ہر کام روی کی پسند پر ہوتا ہے۔ "تمہاری اپنی پسند کوئی نہیں؟" "کبھی میری۔ کبھی ان کی ۔۔۔ وہ کبھی میری بات نہیں ٹالتے۔ میں کبھی اُن کا دل نہیں توڑتی ۔۔۔" آپ۔ انورادھا نے سادگی سے جواب دیا۔

"مجھے تو روی کی خوش نصیبی پر رشک آتا ہے!" وہ حسرت ناک لہجے میں بولا۔ اُس نے سوالیہ نگاہیں اٹھا دیں۔ پلکیں کانپتی رہیں۔ اشوک دھیرے سے مسکرانے لگا۔ مسکراہٹ جس کے کئی پہلو تھے، ناکام حسرتیں ۔۔۔ گھایل آرزوئیں اور طنز۔ "روی خوش نصیب ہے جو تم اس کی ساتھی ہو۔ تم نے تو زندگی کو سورگ بنا دیا ہے"

"نہیں! یہ میری اچھی قسمت ہے جو روی کے دامن سے میرا دامن بندھا۔ وہ ایک نیک مزاج۔ سیدھے انسان ہیں۔ میں اپنا سارا جیون بھی اُن کے لیے تیاگ دوں تو کم ہے" وہ بڑے اعتماد سے بولی "ہاں! قسمت والوں کو ہی اچھے ساتھی ملتے ہیں۔ سنجوگ کی بات ہے!" وہ ایک گہری آہ بھر کر بولا۔ اور بجھے سگریٹ سے دوسرا سگریٹ سلگانے لگا۔

"تمہیں کس بات کی کمی ہے؟" انو نے اون کا پھندہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"یہ پوچھو کس بات کی کمی نہیں ہے! میں نے کیا کھویا کیا پایا۔ تم نے تو جیون بنا لیا مجھ سے یہ بھی نہ ہو سکا۔ تمہاری پیاس بجھ گئی۔ تمہیں ساحل مل گیا۔ میں سدا سے سلگتا رہا ہوں۔ بھٹکتا رہا ہوں۔ میں نے کچھ بھی نہیں پایا۔!! تم جانتی ہو شیلا کس قدر مغرور اور خود سر لڑکی ہے۔ قسمت نے جب مجھے شیلا کے جیون سے باندھ دیا تو میں نے سوچا۔ چلو یونہی سہی۔ وہ مجھے اپنے پیار کے ساگر میں ڈبو دے گی۔ تو میں بھی اپنے گھایل من کو سنبھالوں گا۔ مگر ۔۔۔ میں پیاسا ہی رہا۔ میرے زخم رستے ہی رہے۔! جو سب کچھ لے کر بھی کچھ نہیں دیتے۔ شیلا ان ہی لوگوں میں سے ہے"

"اوہ! دیدی پر الزام نہ لگاؤ۔ میں سن نہ سکوں گی!" وہ تڑپ اٹھی۔ پلکیں جھکی ہی رہیں لیکن اُس نے محسوس کیا کہ اشوک برابر اُسی کو دیکھے جا رہا ہے۔ اس کے جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔

"آج تو تمہیں سب کچھ سننا پڑے گا۔ رادھا!" اشوک گہرے کرب سے بول اٹھا اور

انو سارے بدن سے لرز گئی۔ اور بے اختیار نگاہیں اٹھ گئیں۔ اشوک کے لبوں پر طنزیہ مسکان تھی "تم نے تو پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ اشوک کس حال میں ہے؟ جی رہا ہے کہ مر گیا ــــ تمہاری دیدی نے بھی میری پروا نہیں کی۔ میرا کوئی خیال نہیں کیا۔ میں برسوں اپنی پوسٹنگ پر اکیلا بھٹکتا رہا ہوں۔ وہ آرام سے میکے میں رہتی ہے۔ کہاں خانہ بدوشوں کی طرح میرے ساتھ بھٹکتی پھرے گی" وہ ہنسا ــ کھوکھلی ہنسی۔

ایک ایک کر کے اشوک کے اطراف تنے ہوئے پردے گرنے لگے۔ بکھرنے لگے۔ اس کے اندر کا اشوک اپنی ساری محرومیوں کے ساتھ انورادھا کے سامنے کھڑا تھا! انو کے دل میں ببول کے کانٹے سے پیوست ہو گئے ــــ لیکن اس نے ضبط کا دامن نہ چھوڑا۔ "تم نے اسے اتنی آزادی کیوں دے رکھی ہے! اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے آتے؟"

انو کے ہاتھوں میں سرد ٹھنڈی سلائیاں جیسے منجمد ہو گئی تھیں۔ ... سارے پھندے پھسل چکے تھے ... ایک بھی سرا اب اس کے بس میں نہیں تھا ... جیون کے تانے بانے بنتے بنتے وہ الجھ گئی تھی۔ اور اب کافی دیر ہو چکی تھی ... وہ الجھے تار کیسے سلجھاتی؟! اشوک کہہ رہا تھا۔ "صرف اس لیے اسے ساتھ لاؤں کہ رات دن مجھ سے جھگڑتی رہے۔؟! اسے کلب کی رنگینیاں چاہئیں۔ وہ گھر کی شمع بن کر نہیں رہ سکتی۔ میں نے زندگی کے سارے سکھ اس کے چرنوں میں ڈال دیے ہیں۔ لیکن وہ خوش نہیں رہ سکتی۔ اور میں گھر کی سکھ شانتی کو ترس ترس گیا ہوں رادھا! بچوں کے پیار کو ترس گیا ہوں۔ جی چاہتا ہے دن بھر کی تھکن کے بعد گھر پہنچوں تو کوئی میرا سواگت کرے ــ بچے میرے پیروں سے لپٹ جائیں اور میں اپنی ساری تھکن ساری پریشانیاں بھول جاؤں۔ ڈوب جاؤں۔ تمہاری دیدی کبھی نہیں پوچھتی کہ میری بھی کچھ آشائیں ہوں گی ... کچھ سپنے ہوں گے۔ تمہارا سکھی جیون دیکھ کر میں کتنا خوش ہوں جیسے سورگ میں آ گیا ہوں"

"اشوک!" ــ انو کے دل کی گہرائیوں سے ایک آہ نکلی۔

"یہ سگریٹ میرا ساتھی ہے۔ کسی بھی وقت مجھ سے جدا نہیں ہوتا۔ میں بھی جلتا ہوں یہ بھی جلتا ہے" وہ آج اپنے زخم چھیل کر نئی لذت سی محسوس کر رہا تھا۔

وہ سہم گئی۔ اور قسم دیدی کہ وہ اس کی دیدی کے ماتھے پر کلنک نہ لگائے گی اور یہ کہ اشوک کسی بھی حال میں یہ رشتہ نہ توڑے! اپنے پتاجی کی لاج رکھ لے۔!! ورنہ وہ اپنی بہن کو اپنے ماں باپ کو صورت نہیں دکھائے گی۔" یوں اچانک ان کی راہیں بدل گئیں۔ اور شیلا کے بیاہ کے فوراً بعد اُس نے روی کے آئے ہوئے پیغام کو قبول کر لیا تھا صرف اس لیے کہ اشوک اور شیلا کی دنیا پر اس کا سایہ تک نہ پڑ سکے۔

اور آج وقت کی دھارا اُسے کہاں لے آئی ہے؟ یہ موڑ کہاں سے آ گیا کہ دو بچھڑے ساتھی اچانک پھر سامنے آ گئے ہیں۔۔۔؟!

یہ دوراہا کیسا ہے؟ وہ کیا کرے۔ وہ کیا کرے؟!۔۔۔ روی کا کریڈٹ بڑھنے والا ہے جس کے لیے وہ برسوں سے کوشاں رہا ہے۔ اور وہ سب کچھ اس کی زندگی میں آنے کو ہے جس کی خود اُسے آشا ہے۔ اونچا عہدہ۔۔۔ عزت دولت۔۔۔ ایک آرام دہ۔۔۔ زندگی۔۔! روی کب سے اپنے حالات سے لڑتا آیا ہے۔ اور اب اشوک نے روی کے لیے کیا کچھ نہ کیا! لیکن۔۔۔ یہ سب احسانات کیوں؟ کیا وہ اس طرح اپنی تشنہ محبت کی تسکین کا سامان کر رہا ہے؟! اشوک کے تصور نے اس کے اعتماد کی دھجیاں اڑا دیں۔ اشوک جو اس کا پہلا پیار تھا! جس کے انتظار میں اُس نے سوتے جاگتے، جیون کے حسین سپنے بنے تھے۔ جو اس کی جوانی کے سپنوں کا شہزادہ تھا۔ وہ ایک طلسمی سحر میں ڈوبنے لگی۔ ایک کومل سا احساس اس کی رگوں میں تیرنے لگا۔" اشوک! اشوک!!" اس کے انگ انگ میں آگ سی بھڑک اٹھی۔۔۔ خیالوں کے آکاش پر بھولی بسری یادوں کی چاندنی آنکھ مچولی کھیلنے لگی۔ وہ مسکرانے لگی۔ اشوک کے نام کے ساتھ کتنی سجل کائنات کھل اُٹھی تھی۔

میں اشوک کو سہارا دوں گی۔۔۔ دیدی نے اُسے کچھ بھی نہیں دیا۔ میں اس کی بیمار آتما میں نئی زندگی ڈال دوں گی۔۔۔ اشوک میرا اپنا تھا۔۔۔ اتنا اپنا دنیا بھر میں کوئی اور نہ تھا! اور اب اشوک کتنا تنہا کتنا دکھی ہے۔ میں اس کے ہونٹوں پر کلیاں سجا دوں گی اس کے سارے آنسو پونچھ دوں گی۔ سارے زخم بھر دوں گی۔ اشوک! اشوک!! وہ ساری رات طوفانی لہروں میں ڈولتی رہی۔ ڈوبتی رہی، ابھرتی رہی۔ ساری رات دُور کنارے پر دیا جلتا رہا۔

OO

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

کچّا دھاگہ

آج سوموار ہے......

ابھی نو بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں، کل کا دن میں نے بے کلی کے نوک دار کانٹوں پر گزارا تھا۔ ہر پہلو میں یادوں کے سینکڑوں کانٹے چُبھ جاتے اور میں تڑپ اُٹھتا۔ وہ سکینڈ کراس نمبر ۱۲ کے گیٹ پر چنبیلی کی بیل کے نیچے میری راہ تکتی ہوگی، یوں جیسے کوئی بُت ایستادہ ہو۔

میں ہزار کوشش کرتا ہوں کہ کوئی دن اس سے پہلے کہ وہ گیٹ پر آئے خود چپکے سے پہنچ جاؤں — لیکن ان تمام مہینوں میں ایک بار بھی یہ موقع نہیں مل سکا ہے۔ وہ کسی بت کی طرح وہاں پہلے سے موجود ملتی ہے۔ دور ہی سے اُسے دیکھ کر میرے دل کی سطح پر انجان خوشی کی لہریں ہلکورے لینے لگتی ہیں۔ میری آنکھوں میں دھنک سی چھا جاتی ہے اور میں جیسے ہَوا کے دوش پر اُڑتا ہوا نمبر ۱۲ تک جا پہنچتا ہوں۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں کرنیں پھوٹنے لگتی ہیں، گلابی ہونٹوں پر چنبیلی کھل اُٹھتی ہے۔

اور میں مشینی انداز میں ڈاک اس کے حوالے کر دیتا ہوں۔ وہ بولتی آنکھوں سے ایک پل مجھے دیکھتی ہے۔ میں جھجک کر مسکرانے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایک پل کو ہماری آنکھیں مل کر جدا ہو جاتی ہیں اور میں سائیکل سنبھال لیتا ہوں..... میرے قدم بوجھل ہو جاتے ہیں۔ میں کسی تھکے ہارے مسافر کی طرح دھیرے دھیرے پیڈل کرنے لگتا ہوں — ایسا لگتا ہے میری سائیکل آگے جانے کی بجائے

[illegible]

[illegible]



[illegible]

ایسا ہی [illegible] بنا کر رکھ پا کر کہیں"۔ ہاں سعدی! تم سے کچھ کہنا ہے۔ بہت دنوں سے ایک [illegible] میری تو کوئی بھی خواہش پوری نہ ہوئی۔ اب ایک امید ہے۔ جو تم سے وابستہ ہے [illegible] کروگے۔" وہ کہتے کہتے ان کی بیمار آنکھوں میں بلا کی بیچارگی امنڈ آئی۔ ایسی ہی جیسی باغباں کی آنکھوں میں اپنے چمن کو آگ دیتے ہوئے چھا جاتی ہے۔

وہ چونکا "مجھ سے وابستہ ہے ــــ! ایسی کیا آرزو ہوگی جو میں پوری کر سکونگا۔"

"کچھ بھی ہے ــــ تم وعدہ کرو تو کہوں۔"

"آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں؟"

"ضرور ہے اسی لیے تو تم سے کہہ بھی رہی ہوں۔ مرنے سے پہلے چاہتی ہوں کہ اپنی محبوب ہستی کو بھیا کہہ کر پکاروں اور ــــ اور ایک پیاری سی بھابی لاؤں" سعدی گم سم سا انھیں تک رہا تھا اس کے لب سل گئے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ بھیا ــــ بھابی ــــ اوہ ــــ

"تم نے ایک مرتبہ پوچھا تھا نا کہ میری محبوب ہستی کون ہے۔ کیا تم یہ سن کر خوش نہیں ہوتے سعدی! میں نے اپنا ایک بھائی کھو دیا تھا۔ اس کا شفیق لمس اس کا پیار کھو دیا تھا ــــ تم ــــ تم یہ سب کچھ لوٹا دو مجھے۔ تم مجھے آپا کہہ کر ایک بار پکارو سعدی! تاکہ میری جنم جنم کی پیاسی روح سکون پالے۔ میں پیار کی بھوکی ہوں سعدی ــــ!" یہ کہتے کہتے انھوں نے سعدی کا ہاتھ تھام کر اُسے آنکھوں سے لگا لیا۔ اُن کی آنکھوں سے ایک سیلاب رواں تھا۔

"یہ آج آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں ــــ میں نے تو ــــ کچھ اور سوچا تھا" وہ اس سے آگے نہ کہہ سکا۔ زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"جو کچھ سوچا تھا وہ غلط تھا سعدی ــــ! تم ابھی بچے ہو ــــ نادان ہو ــــ میرے بھیا ــــ!"

اور سعدی۔ شمع آپا کا ہاتھ پکڑ کر سسک پڑا "شمع آپا ــــ! میں نے آپ کو کچھ نہیں دیا تو دکھ بھی نہیں دوں گا۔

"میرے بھیا ــــ!" وہ روتے روتے مسکرائیں جیسے برسات میں دھنک۔ سعدی جلدی سے منہ پھیر کر باہر نکل گیا۔

چراغ جلادو

"تم اپنی بچّی کی زندگی چاہتے ہو تو فوراً اس کی کینسر زدہ آنکھ نکالنے کی اجازت دے دو۔
ورنہ کینسر اس کے سارے جسم میں پھیل جانے کا خطرہ ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے مسٹر —
لیکن اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔" سرجن گپتا نے بھرے گلے سے کہا۔
"ڈ۔۔ ڈاکٹر!" باپ کی سسکی سینے میں ہی گھٹ گئی "تو۔۔ تو کیا۔ میری ننھی
بچّی کی ایک آنکھ ضائع ہو جائے گی؟!"
"نہیں۔ نہیں۔" ممتا چیخ پڑی — ایسا نہ کہو — ایسا نہ کہو۔"
"میں نے کہا نا کہ یہی ایک راستہ ہے تمھاری بچّی کو بچانے کا — ورنہ —" اور
ڈاکٹر نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"بھئی، مجھے ایک چار سالہ بچّی کی کینسر زدہ آنکھ کو نکالنا ہے — لیکن مجھے کسی اور
مریض کو بھی ارجنٹ اٹنڈ کرنا ہے — تم اس بچّی کا آپریشن کر دو — اس کی دائیں آنکھ نکالنی
ہے، ورنہ بچّی کے دماغ تک کینسر پھیل سکتا ہے! جس سے وہ مر سکتی ہے۔"
"دائیں آنکھ؟" سرجن کمار نے کیس کو سمجھتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں ہاں، دائیں آنکھ — یو ڈو یہ ممبر

LEFT EYE ... NOTE DOWN PLEASE

• یس ڈاکٹر ــــ آئی ول نوٹ ڈاؤن

• تھینک یو ــــ آئی ایم اے بزی ــــ ہائی!"

اور سرجن کمال نے اپنے نوٹ کے کاغذ پر نوٹ کر لیا ــــ *LEFT EYE*

گوری چٹی گلاب جیسی خوبصورت چار سالہ بے بی جو وارڈ میں کھیلتی کودتی پھرتی تھی جو اپنی پیاری پیاری باتوں سے سب کے دلوں میں گھر کر چکی ہے۔ قسمت کی ستم ظریفی سے بے خبر آپریشن تھیٹر لے جائی گئی ہے۔ بند دروازے کے باہر بچی کے ماں باپ اور عزیز جمع ہیں۔ چہرے بے رنگ اور پژمردہ ــــ باپ کی آنکھوں میں سوال کا سناٹا۔ اور ماں لب کی طلب پریشانی ہوتی ــــ [illegible] ٹھیک تین گھنٹوں کے طویل آپریشن کے بعد دروازہ کھلا۔ ایک ایک کر کے ڈاکٹر نکلیں .... سبھی باہر نکلے ــــ اور چھوٹی سی سٹریچر پر بے ہوش بے بی کو باہر لایا گیا ــــ ماں باپ دوڑے۔ دھڑکتے ہوئے دل ــــ اشکوں سے لبریز آنکھیں ــــ

اور دوسرے ہی لمحے ماں کی ہچکی بھری چیخ سے دل دہل گئے۔

"نہیں ــــ میری بچی کی بائیں آنکھ کہاں ہے؟ ــــ میری بچی کی بائیں آنکھ ــــ"

اور ایک بھونچال سا آگیا ــــ ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ درحقیقت حقیقت ننگی تلوار کی طرح سامنے آگئی ــــ کہ ڈاکٹروں کی غفلت اور لاپرواہی نے بچی کی صحیح آنکھ نکال دی ہے اور بیمار آنکھ رہ گئی ہے۔

امید کی ایک آخری کرن تھی جو بجھ چکی تھی۔ [illegible] بیٹیوں کی گہری کالی اندھیری کھو کر رہ گئی ــــ چاند سورج اندھیرا ــــ اندھیرا ہی اندھیرا ــــ زندگی کے گھپ اندھیرے کی گرفت میں۔

سب ختم ہے ــــ حقیقت کے تھپیڑے سے جگمگی آنکھ ٹوٹ گئی ہے ــــ

٥٥

[illegible]

[illegible] — [illegible] —

«[illegible] — [illegible]»

«[illegible] — [illegible]»

[illegible]

[illegible]

ے اپنے مقام پر۔ روز ہی صبح مسکراتی ہے چنبیلی کھلتی ہے۔ چمن میں بہار آتی ہے۔ روز ہی زندگی اپنی ساری رنگینیاں لے کر آتی ہے... لیکن تم... تم نہیں آتے۔ تم نہیں آتے!!

کیوں میرے محبوب؟ تم نے تو کہا تھا جلد ہی واپس آؤں گا... لیکن اتنے سارے دن گزر گئے ہیں... جیسے ایک صدی ایک دن بیت گیا ہو، میری زندگی پھیکی پھیکی سی سونی سونی سی ہے تمہارے بنا ـــ تم نہیں تو زندگی نہیں ـــ جانِ من! اب اتنی بھی کیا مصروفیت،... ایسا بھی کیا کام کہ مہینے بھر سے گھر کی یاد نہیں آئی۔ سچ کہنا، کسی کی یادوں کے جھونکے کوئی سندیس نہیں لاتے، چاند کچھ نہیں کہتا۔؟! ستارے بھی کچھ نہیں کہتے؟!

جانے کیوں،... رہ رہ کر تمہارے قدموں کی چاپ دل کے آنگن میں گونجنے لگتی ہے اور میں صدر دروازے کی طرف لپک جاتی ہوں،... پھر مایوس ہو کر اپنا زخمی وجود سنبھالے بوجھل قدموں واپس چلی آتی ہوں۔ تم نہیں آئے... تم نہیں آئے۔ نہ تم آئے نہ کوئی خط۔ میرا دل اتنی زور سے کیوں دھڑکنے لگا ہے... اک خوف سا رگوں میں اترنے لگا... جیسے زہر سا گھول دیا گیا ہو۔ تم کیوں نہیں آئے۔ کیوں نہیں!! ـــ میں ہر پل تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگتی ہوں۔ تمہاری واپسی کی التجائیں کرتی ہوں۔ سجدے میں پڑے پڑے ہزاروں آنسو بہا ڈالتی ہوں۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہوں تو جانے کون کون سی دعائیں دل کی زبان سے نکلنے لگتی ہیں۔ دل بھر بھر آتا ہے۔ ایسا کیوں؟ ایسا کیوں؟! میرے ہمدم! اب کسی بھی طرح وہاں سے چلے آؤ۔ بخدا ـــ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ میری روح لرز اٹھتی ہے۔ تم وہاں تنہا ہو۔ نہ ساتھی نہ غمگسار ـــ جانے کن حالات میں گرفتار ہو ـــ جانے کہاں ہو؟ کیسے ہو! میری زندگی! ایک خوف ایک دہشت سی طاری ہے مجھ پر! بُرے بُرے خواب نظر آتے ہیں۔ تم نے مہینہ بھر سے خط کیوں نہیں لکھا؟ ـــ کوئی خبر بھی نہیں بھیجی۔ یہاں امی ـــ بابا! نہیں سب کو تمہارا خیال ہے سب تمہارے لیے حیران و پریشان ہیں۔ سب کو تمہارا انتظار ہے۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے میرا تصور تمہارے ہی گرد گھومتا رہتا ہے۔ جیسے طواف کر رہی ہوں ـــ تم ـــ تم کہاں ہو؟! ـــ ان سب کی آنکھوں میں خوف کا طوفان سا چھپا نظر آتا ہے۔ لب بھینچے ہوئے، چہرے متاسف سے، کیا بات ہے؟ ارے کوئی تو کہو تم سب اتنے خاموش کیوں ہو؟ کوئی نہیں بتاتا۔ بات

ہے اپنے مقام پر۔ روز ہی صبح مسکراتی ہے۔ چنبیلی کھلتی ہے۔ چمن میں بہار آتی ہے۔ رو
زندگی اپنی ساری رنگینیاں لے کر آتی ہے... لیکن تم... تم نہیں آتے۔ تم نہیں آتے!!
کیوں میرے محبوب؟ تم نے تو کہا تھا جلد ہی واپس آؤں گا... لیکن اتنے سال
گزر گئے ہیں... جیسے ایک صدی ایک دن بیت گیا ہو۔ میری زندگی پھیکی پھیکی سی سونی س
تمہارے بنا۔ تم نہیں تو زندگی نہیں ــــ جانِ من! اب اتنی بھی کیا مصروفیت...!!
کام کہ مہینے بھر سے گھر کی یاد نہیں آئی۔ سچ کہنا کسی کی یادوں کے جھونکے کوئی سندیس نہ
چاند کچھ نہیں کہتا۔؟! ستارے بھی کچھ نہیں کہتے؟!

جانے کیوں... رہ رہ کر تمہارے قدموں کی چاپ دل کے آنگن
اور میں صدر دروازے کی طرف لپک جاتی ہوں... پھر مایوس ہو کر اپنا
بوجھل قدموں واپس چلی آتی ہوں۔ تم نہیں آئے... تم نہیں آئے۔ نہ تم آ
دل اتنی زور سے کیوں دھڑکنے لگا ہے... اک خوف سا رگوں میں اترنے لگا
گھول دیا گیا ہو۔ تم کیوں نہیں آئے۔ کیوں نہیں!! ــ میں ہر پل تمہاری ر
مانگتی ہوں۔ تمہاری واپسی کی التجائیں کرتی ہوں۔ سجدے میں پڑے پڑے
ڈالتی ہوں۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہوں تو جانے کون کون سی دعائیں
نکلنے لگتی ہیں۔ دل بھر بھر آتا ہے۔ ایسا کیوں؟ ایسا کیوں؟! میرے ہمدم!! ا
سے پہلے آؤ۔ بخدا۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ میری روح لرز اٹھتی ہے۔ تم
نہ غمگسار ــ جانے کن حالات میں گرفتار ہو۔ جانے کہاں ہو؟ کیسے ہو!
خوف ایک دہشت سی طاری ہے مجھ پر! برے برے خواب نظر آتے
سے خط کیوں نہیں لکھا؟ ــ کوئی خبر بھی نہیں بھیجی۔ یہاں امی ــ بابا نہیں
ہے سب تمہارے لیے حیران و پریشان ہیں۔ سب کو تمہارا انتظار ہے
جاگتے میرا تصور تمہارے ہی گرد گھومتا رہتا ہے۔ جیسے طواف کر رہی ہو
ہو؟! ــ ان سب کی آنکھوں میں خوف کا طوفان سا چھپا نظر آتا ہے۔ لب
متاسف سے، کیا بات ہے؟ ارے کوئی تو کہو تم سب اتنے خاموش کیوں ہو؟

کسی دوسری جگہ پر منتقل ہو رہے تھے۔ ایک ایک کر کے تم نے کئی لوگوں کو محفوظ مقام پر بھجوایا اور سب سے آخر میں اپنے آفس کے دو اور ساتھیوں کو لے کر تم اپنی جیپ میں آ بیٹھے تھے ـــــ کہ خود بھی وہاں پہنچ جاؤ ـــــ اور جیسے ہی جیپ اسٹارٹ کی ـــ ٹائم بم پھٹ پڑا ـــــ دھماکے کے ساتھ جیپ اڑ گئی ـــ تم زخمی ہو گئے تھے ـــ تمھارے ساتھی بھی ـــ سب کو ہسپتال لے جایا گیا۔ مہینہ بھر تم اسپتال میں اکیلے پڑے تڑپتے رہے ـــ آہ ـــ آہ! کتنی بے بسی کتنی بے چارگی ہوگی ـــ کسی نے ہمیں اطلاع نہ دی۔ پتہ ہوتا تو ہم جان ہتھیلی پر رکھ کر بھی تمھارے پاس پہنچ جاتے ـــ یا تھیں لے آتے۔ تم زخمی حالت میں کراہتے رہے۔ اور ہم ـــ تم سے دور ـــ تمھاری سلامتی کی دعائیں مانگتے رہے۔ کیا مشرقی بنگال تمھارے لیے کربلا بن گیا تھا اعزاز؟ حضرت امام حسینؓ کو جس طرح کربلا میں شہید کیا گیا تھا ـــ اُسی طرح تمھیں بھی پردیس میں شہید کیا گیا ہے بے بس تنہا۔ مجبور ـــ اعزاز! کیا اب کبھی میں تمھیں نہیں دیکھ سکوں گی تم تو ہنستے مسکراتے خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکلے تھے ـــ تم تو ترقی پر وہاں گئے تھے ـــ جلد مجھے بھی لے جانے کا وعدہ کیا تھا تم نے ـــ نہیں نہیں۔ یہ جھوٹ ہے ـــ کہ تم ـــ تم ـــ آہ! میں کہاں ڈھونڈوں تمھیں ـــ کہاں دیکھوں تمھاری وہ صورت ـــ کہاں سنوں گی وہ آواز ـــ تو کیا ـــ اب سب کچھ ختم ہو چکا ـــ سب کچھ مٹ گیا ہے!! اے دنیا والو ـــ سنو ـــ میں پوچھتی ہوں تمھیں کیا حق تھا کہ تم نے ایک بے گناہ معصوم انسان کی جان لے لی۔ تم نے میرا سہاگ کیوں چھین لیا ـــ تم ـــ ظالم ہو ـــ جابر ہو ـــ وطن کے نام پر ـــ زمین کے نام پر کروڑوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والو ـــ ہزاروں لاکھوں کو لہو کا غسل دینے والو ـــ ماؤں کی گود خالی کرنے والو ـــ بہنوں کی چوڑیاں چور چور کرنے والو ـــ تم تم انسان نہیں ہو شیطان ہو ـــ تم قاتل ہو ـــ قاتل ـــ ایک دن تم کو بھی منصفِ اعلیٰ کے سامنے جواب دینا ہوگا اس بارِ الٰہی کے سامنے جس نے تمھیں اشرف المخلوقات کا شرف بخشا۔ بتاؤ کیا کہو گے کہ تم نے اس کی زمین کو دوزخ کا نمونہ بنا رکھا تھا ـــ خون کی ہولیاں کھیلیں اور بھائی بھائی کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے؟! تم نے ایک نہیں کتنے ہی اعزازوں کا خون کیا۔ کتنی ہی صوفیاں اپنے اعزاز کی راہ تکتی رہ گئیں ـــ؟!

یہ میری آنکھوں کے سامنے دھواں سا کیسا اُٹھ رہا ہے ـــ پھیل رہا ہے فضا میں کیسی

رہے ہیں ــــ جتنی اور جیسی دعائیں مانگی جا سکتی ہیں مانگ رہے ہیں ــ منتیں مرادیں کر چکے ہیں ــ میں
لئے میں ہوں بیٹھی بن گئی ہوں ــ میری پھٹی پھٹی آنکھیں دروازے پر لگی رہتی ہیں ــــ اور کان تمہارے
موں کی چاپ پر!

آجاؤ میرے محبوب! ظلم کی اس بستی سے نکل کر میرے پاس آجاؤ ــــ اپنی صوفی کو زندگی دے دو ــــ ! ہائے وہ کیسی گھڑی تھی ــ جب تم نے گھر کی دہلیز سے قدم نکالا منحوس ساعت! ــ کاش وہ گھڑی نہ آتی ــــ میں اس سے پہلے کہ تم قدم اٹھاتے تمہارے قدموں میں مرجاتی ــــ تمہارے قدموں میں میری زندگی تمام ہوجاتی ــ مگر ــ مگر ــ قسمت کا لکھا کس نے مٹایا ہے ــ ؟ اس نراس کے تانے بانے بنتے بنتے دن ڈھل رہے ہیں، کوئی آتا ہے تو چونک اٹھتی ہوں ــ شاید تم آگئے !! شاید تمہاری خبر آئی ہے ؟ کوئی تو آئے جو تمہاری خبر دے ــ اے چاند ستارو ــ اے کلیو ــ اے ہواؤ ــ !!

تب ایک اندھیری شام، تمہارے دوست اعظم آگئے ۔۔۔ میں پردے کے پاس آکھڑی ہوں ــ چاہتی ہوں اعظم کے پاس جاؤں اور تمہاری خبر پوچھوں ــــ ارے ــ یہ کیا؟ بیٹھے بیٹھے بابا چکرا کر بے ہوش ہوگئے ــ امّی ــ بھیا! ارے دیکھو تو آ بابا کو کیا ہوا ــ اعظم نے کیا کہا ــ کیا کہا ؟! کوئی کہہ دو ــــ کہہ دو مجھ سے کہ اعظم نے کیا خبر دی ــ کیا بتایا ہے ــ میں چیخ رہی ہوں ــ پاگلوں کی طرح چلا رہی ہوں ــ اور جب بابا کو ہوش آیا ــــ تو بچوں کی طرح رونے لگے ــ " اب ــــ اب وہ کبھی نہیں آئے گا بیٹی! کبھی نہیں آئے گا ــ وہ ــ وہ ہم سے روٹھ گیا ہے ــ کھو گیا ہے ــ میری بچی! " میرے ذہن میں توپوں کی گھن گرج کا شور سما گیا ہے ــــ نہیں ــــ ! میری چیخ اتنی ڈراؤنی ہے کہ میں خود سہم گئی ہوں ۔

اعزاز ــــ اعزاز یہ میں کیا سن رہی ہوں ــ کہ تم ــــ تم دشمنوں کے فریب کا نشانہ بن گئے ــ نہیں نہیں ــ تم زندہ ہو ــــ سلامت ہو ــ کوئی تمہیں مار نہیں سکتا ــ کوئی تمہیں قتل نہیں کر سکتا ــ میں نے خدا سے رو رو کر تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگی ہیں ــ اپنے سہاگ کی دعائیں مانگی ہیں ــ تم ــ تم زندہ ہو ــ زندہ رہو گے اعزاز ۔۔۔۔۔ اعظم نے بتایا کہ جس دن جنگ بند ہوئی تھی ۔۔۔ اس دن ــ ہاں اُسی دن دشمنوں نے تمہیں بھی دھوکہ دیا ــ تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ

کسی دوسری جگہ پر منتقل ہو رہے تھے۔ ایک ایک کر کے تم نے کئی لوگوں کو محفوظ مقام پر بھجوایا اور سب سے آخر میں اپنے آفس کے دو اور ساتھیوں کو لے کر تم اپنی جیپ میں آ بیٹھے تھے ــــ کہ خود بھی وہاں پہنچ جاؤ ــــ اور جیسے ہی جیپ اسٹارٹ کی۔ ٹائم بم پھٹ پڑا ــــ دھماکے کے ساتھ جیپ اڑ گئی ــــ تم زخمی ہو گئے تھے ــــ تمہارے ساتھی بھی ــــ سب کو ہسپتال لے جایا گیا۔ مہینہ بھر تم اسپتال میں اکیلے پڑے تڑپتے رہے ــ آہ ــ آہ! کتنی بے بسی کتنی بے چارگی ہو گی ــ کسی نے ہمیں اطلاع نہ دی۔ پتہ ہوتا تو ہم جان ہتھیلی پر رکھ کر بھی تمہارے پاس پہنچ جاتے۔ یا تمہیں لے آتے۔ تم زخمی حالت میں کراہتے رہے۔ اور ہم ــ تم سے دور ــ تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگتے رہے۔ کیا مشرقی بنگال تمہارے لیے کربلا بن گیا تھا اعزاز؟ حضرت امام حسینؓ کو جس طرح کربلا میں شہید کیا گیا تھا۔ اسی طرح تمہیں بھی پردیس میں شہید کیا گیا ہے بے بس تنہا۔ مجبور۔ اعزاز! کیا اب کبھی میں تمہیں نہیں دیکھ سکوں گی؟ تم تو ہنستے مسکراتے خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکلے تھے۔ تم تو ترقی پر وہاں گئے تھے۔ جلد مجھے بھی لے جانے کا وعدہ کیا تھا تم نے۔ نہیں نہیں۔ یہ جھوٹ ہے ــ کہ تم ــ تم ــ آہ! میں کہاں ڈھونڈوں تمہیں ــ کہاں دیکھوں تمہاری وہ صورت۔ کہاں سنوں گی وہ آواز۔ تو کیا ــ اب سب کچھ ختم ہو چکا۔ سب کچھ مٹ گیا ہے!! اے دنیا والو۔ سنو ــ میں پوچھتی ہوں تمہیں کیا حق تھا کہ تم نے ایک بے گناہ معصوم انسان کی جان لے لی۔ تم نے میرا سہاگ کیوں چھین لیا؟ تم ــ ظالم ہو ــ جابر ہو ــ وطن کے نام پر ــ زمین کے نام پر کروڑوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والو ــ ہزاروں لاکھوں کو لہو کا غسل دینے والو ــ ماؤں کی گود خالی کرنے والو۔ بہنوں کی چوڑیاں چور چور کرنے والو ــ تم تم انسان نہیں ہو شیطان ہو۔ تم قاتل ہو ــ قاتل ــ ایک دن تم کو بھی منصفِ اعلیٰ کے سامنے جواب دینا ہو گا اس بارِ الٰہی کے سامنے جس نے تمہیں اشرف المخلوقات کا شرف بخشا۔ بتاؤ کیا کہو گے کہ تم نے اس کی زمین کو دوزخ کا نمونہ بنا رکھا تھا ــ خون کی ہولیاں کھیلیں اور بھائی بھائی کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے؟! تم نے ایک نہیں کتنے ہی اعزازوں کا خون کیا۔ کتنی ہی صوفیاں اپنے اعزاز کی راہ تکتی رہ گئیں ــ؟!

یہ میری آنکھوں کے سامنے دھواں سا کیسا اٹھ رہا ہے، ــ پھیل رہا ہے فضا میں کیسا

گھٹی گھٹی چیخیں ہیں! یہ کیسی بُو ہے۔ لہو کی بُو۔ دھوئیں کی چادر کے پرے یہ سُرخ سُرخ سے دھبّے کیسے ہیں؟ — جو لمحہ بہ لمحہ پھیلتے جا رہے ہیں ۔۔۔ ارے۔ یہ تو دریا ہے۔ لہو کا دریا۔ لہروں میں ڈوبتی ابھرتی لاشیں ہیں — لاشیں — نہیں۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لی ہیں۔۔ اور چلا رہی ہوں ۔۔ مجھے بتاؤ اے دنیا والو کہ میں نے تمھارا کیا بگاڑا تھا؟ تم نے زمین کے ٹکڑے کیے تو کیے دلوں کو بھی گولیوں کی زد پر رکھ دیا؟! تمھارے ہاتھوں پر لگا ہوا یہ لال قاتل رنگ قیامت تک نہ چھوٹے گا۔ تم نے ہزاروں موتیوں کو پاگل بنا ڈالا ہے۔ آؤ آؤ ایک خون اور سہی۔ اپنے ہاتھوں کا رنگ اور گہرا کر لو۔ مجھ کو بھی بم سے اڑا دو۔ میرے بدن کو بھی زخموں سے چور کر دو۔ بکھیر دو۔ ریزہ ریزہ کر دو۔ یہ زمین کس کس کے لہو میں نہا چکی ہے اور کس کس کے لہو میں اس کو نہانا ہے؟! آہ اعزاز آؤ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاؤ — میں تمھارے بغیر ایک پل زندہ نہ رہ سکوں گی۔ یہ زندگی جہنم سے کم نہیں ہے۔ مجھے بھی اس جہنم سے نجات دے دو اعزاز۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ تم اب دنیا میں نہیں ہو۔ کیسے مان لوں کہ تمھیں دیکھا تک نہیں۔ نہ زخمی حالت میں ۔۔۔ نہ موت کی دہلیز پر سسکتے ہوئے۔ میں نے تمھیں سجا سنوار کر پوری تیاری کے ساتھ روانہ کیا تھا نا! آہ اعزاز۔ تمھارے دوست نے تمھارے لباس، تمھاری چیزیں یہاں پہنچائی ہیں — آہ یہ چیزیں! — یہ تمھاری ہیں تم نے انھیں چھوا ہے۔ ان میں تمھاری خوشبو ہے۔ تمھارا لمس سمایا ہوا ہے۔ میں ان چیزوں کو سینے سے لگا کر پیار کرتی ہوں۔ آنکھوں سے لگاتی ہوں۔ روتی ہوں اب تم کہاں؟! تمھارے ساتھ سب بہاریں چلی گئیں۔ ہونٹوں کا تبسم۔ آنکھوں کی روشنی۔ دل کی دھڑکنیں۔ سب چلی گئیں۔ تمھاری سجائی ہوئی عالیشان کوٹھی گورستان لگتی ہے۔ یہ ہوائیں سسکتی ہیں۔ تمھارا ماتم کرتی ہیں۔ چنبیلی آہیں بھرتی ہے۔ گھر کی ہر شے تمھاری یاد میں گم صم ہے۔ پاگل ہے۔ اور میں۔ دیوانوں کی طرح۔ تنہا۔ زخمی دل۔ زخمی روح، مردہ جسم لیے جی رہی ہوں۔ رہ رہ کر تمھاری آوازیں کانوں میں گونجتی ہیں اور میں دوڑ کر صدر دروازے تک چلی جاتی ہوں۔ وہاں کوئی نہیں ہوتا! اور میں اپنا زخمی وجود سنبھالے اپنے ویران کمرے میں پلٹ آتی ہوں ۔ ۔ ۔ کیا۔ تم کبھی نہ آؤ گے؟! کبھی نہ آؤ گے؟!!

OO

[illegible]

[illegible]

[illegible]

زندگی کی ناؤ کو سنبھال لے۔ اپنی دو بہنوں کی مانگ بھر دے۔ بھائی کا ہاتھ تھام لے۔ بابا اور امّی دعائیں
کے چراغ جلانے لگتے۔ امّی کی پرانی کھانسی نے انھیں الگ مجبور کر رکھا تھا۔ دو قدم چلتیں تو دم پھولنے لگتا۔ چھوٹی
لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر چلتیں۔ پسینہ پسینہ ہو جاتیں۔ مگر ایک فرض تھا جو انھیں تھک کر بیٹھنے نہ دیتا
وہ برابر اسکول کی ڈیوٹی پوری کرتیں اور شام کو گھر پہنچتیں تو بستر پر پڑ جاتیں۔ یوں محسوس کرتیں
کہ اب وہ کبھی بھی اُٹھ نہ پائیں گی۔ لیکن جوں ہی بیٹے کی آہٹ سنتیں مشین کی طرح اٹھ کر بیٹھ جاتیں
کہیں میرا بچہ پریشان نہ ہو جائے۔ سارا دن کتابوں میں سر کھپاتا ہے نا!
"آگئیں امّی! تھک گئیں نا — بس امّی چند دن اور — پھر میں آپ کو آرام سے رکھوں گا"
وہ پیار سے امّی کے گلے میں باہیں ڈال دیتا۔
"ہاں بیٹا!! خدا کرے وہ دن جلد آئے" وہ پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتیں
"چلو تم کچھ کھا لو!" بہن ٹرے میں چائے بسکٹ لے آتی — سب مل کر ہنستے بولتے مستقبل
کے خواب سجانے لگتے۔
اور اب ڈپلوما حاصل کیے بھی تو دو سال گزر گئے تھے۔ سہانے خواب ابھی تک
خواب ہی تھے۔ کوئی سپنا سچ نہ ہوا۔ کوئی ارمان ابھی پورا نہ ہو سکا۔ بابا کی ضعیفی۔ امّی کی بیماری
دو بہنوں کی سونی کلائیاں۔ بھائی کا فرض — اور خود وہ بیکار۔ مخلص اور زندہ دل۔ ہر مصیبت
کو ہنس کر جھیلنے والا شاہد۔ آج کتنا بے سہارا اور ٹوٹا بکھرا ہے۔ اُسے تو خود اپنے وجود کو سمیٹنا
مشکل لگ رہا تھا۔ وہ اپنے بکھرے کنبے کو کیا سمیٹ سکتا ہے۔ وہ کیا کرے؟ کہاں جائے
ایسے میں بنگلور کی کسی فیکٹری سے اُسے انٹرویو آگیا۔ مارے خوشی کے وہ ناچ اُٹھا۔ جیسے
سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا ہو۔ سوکھی دھرتی پھر ایک بار حسرت سے آسمان کو تکنے لگی۔ بادل جھوم جھوم
کر آنے لگے۔ سرد ہوائیں چلنے لگیں۔ "امّی! مجھے انٹرویو آگیا ہے۔ بابا دعا کریں کہ کامیاب
ہو جاؤں" بابا کے جھریوں دار چہرے پر شفقت پھوٹ پڑی۔
"اے پروردگار! میرے بچے کی زندگی سنوار دے۔ میرے لال کا مستقبل شاندار
بنا دے"
امّی نے سینے سے لگا کر دعائیں دیں۔ سب نے دعاؤں کے پھول بکھیر دیے۔ عید

[...]وں نے بتایا کہ کچھ نوجوان اپنے محلّے کی ماؤں بہنوں کی حفاظت کا پروگرام بنا رہے تھے۔ اور
[...]بد کو بھی اس سلسلے میں صلاح مشورے کے لیے بلایا تھا — سبھی مل کر ابھی غور و خوض کر رہے
[...]ے کہ اچانک سامنے سے ایک بم آکر گرا — دو چار اور لڑکے بھی زخمی ہو گئے لیکن شاہد چونکہ
[...]ں کا نشانہ تھا زیادہ ہی جھلس گیا۔ بے نور آنکھوں میں تمام خواب سو گئے۔ ہونٹوں پر حسرت
[...]ری مسکراہٹ دم توڑ گئی۔ عین بہاروں کے موسم میں برقِ ستمگر نے آشیاں جلا ڈالا۔ سوکھی پیاسی
[...]ھرتی پر بادل نہیں برسے۔ بجلی کوند گئی اور ماں کا سینہ پھٹ گیا — لہولہان ہو گیا۔ کون ہے
[...]و ایک دکھیاری ماں کو تسلّی دے — جس کا جوان بیٹا بربریت اور دہشت پسندی کا نشانہ بن گیا
[...]ون ہے جو اس بوڑھے باپ کو سہارا دے جس کی زندگی بھر کی کمائی لٹ گئی جس کی لاٹھی ٹوٹ
[...]ئی۔ اب بہن کی مانگ میں افشاں کون بھرے گا؟ اس کی ڈولی کون اٹھائے گا؟ ننھے بھائی کا
ہاتھ کون تھامے گا —؟!

تھکی ہاری ماں سے اب یہ کون کہے گا کہ ماں تم اب نوکری چھوڑ دو۔ میں تمہارا علاج
کرواؤں گا۔ ماں! تمہیں آرام سے رکھوں گا!

امّی بڑبڑانے لگیں "نہیں نہیں! میرا لال زندہ ہے۔ اُسے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اُسے
تو کل ڈیوٹی پر جانا ہے — وہ شہر دائنز بن گیا ہے نا۔ میرا چاند" وہ پھر بے ہوش ہو گئیں —
بابا کو غشی پہ غشی آ رہے تھے۔

پولیس آئی — اور اس کی لاش لے گئی۔ کسے اتنا ہوش تھا کہ بیٹے کو جی بھر کر دیکھ لیتے —
بیٹے کا جلوس بھی تو نہ دیکھ سکے —

دوسرے دن پوسٹ مارٹم کے بعد پولس کے پہرے کے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے لاش
گھر لائی گئی — پتھر کے کلیجے پانی پانی ہو گئے — وہ ہر دل عزیز یاروں کا یار — آخری سفر پر
جا رہا تھا۔ آگ اور نفرت کی ہولی میں اس کا لہو بوند بوند کر کے اچھالا جا چکا تھا۔ اس کی جوانی
اور حسن — اس کے خواب — ماں باپ کی تمنائیں — بہنوں کی آرزوئیں سبھی کچھ نفرتوں
کے الاؤ میں بھسم ہو چکے تھے۔ شاہد کا بھرا پُرا گھر خون کی اس ہولی میں جلا تھا — اس کا گناہ
کیا تھا؟

سب کی ڈری سہمی آنکھوں میں ایک ہی سوال تھا؛

کیوں؟ ——

کیوں؟ ——

کوئی بتائے —— کہ یہ نفرتوں کا کھیل کب تک جاری رہے گا۔

کوئی بتائے کہ —— ایسے کئی شاہدوں کے گھر۔ کب تک جلائے جائیں گے؟

—— اور کیوں؟!

OO

لوگوں نے بتایا کہ کچھ نوجوان اپنے محلے کی ماؤں بہنوں کی حفاظت کا پروگرام بنا رہے تھے۔ اور شاہد کو بھی اس سلسلے میں صلاح مشورے کے لیے بلایا تھا۔ سبھی مل کر ابھی غور و خوض کر رہے تھے کہ اچانک سامنے سے ایک بم آ کر گرا ـــ دو چار اور لڑکے بھی زخمی ہو گئے لیکن شاہد چونکہ اُن کا نشانہ تھا زیادہ ہی جھلس گیا۔ بے نور آنکھوں میں تمام خواب سو گئے۔ ہونٹوں پر حسرت بھری مسکراہٹ دم توڑ گئی۔ عین بہاروں کے موسم میں برق ستمگر نے آشیاں جلا ڈالا۔ سوکھی پیاسی دھرتی پر بادل نہیں برسے۔ بجلی کوندگئی اور ماں کا سینہ پھٹ گیا ـــ لہولہان ہو گیا۔ کون ہے جو ایک دکھیاری ماں کو تسلی دے ـــ جس کا جوان بیٹا بربریت اور دہشت پسندی کا نشانہ بن گیا۔ کون ہے جو اس بوڑھے باپ کو سہارا دے جس کی زندگی بھر کی کمائی لٹ گئی۔ جس کی لاٹھی ٹوٹ گئی۔ اب بہن کی مانگ میں افشاں کون بھرے گا؟ اس کی ڈولی کون اٹھائے گا؟ ننھے بھائی کا ہاتھ کون تھامے گا ـــ؟!

تھکی ہاری ماں سے اب یہ کون کہے گا کہ ماں تم اب نوکری چھوڑ دو۔ میں تمہارا علاج کرواؤں گا۔ ماں! تمہیں آرام سے رکھوں گا۔

امّی بڑبڑانے لگیں "نہیں نہیں! میرا لال زندہ ہے۔ اُسے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اُسے تو کل ڈیوٹی پر جانا ہے۔ وہ شہر وائزر بن گیا ہے نا۔ میرا چاند" وہ پھر بے ہوش ہو گئیں ـــ

بابا کو غش پہ غش آ رہے تھے۔

پولیس آئی۔ اور اس کی لاش لے گئی۔ کسے اتنا ہوش تھا کہ بیٹے کو جی بھر کر دیکھ لیتے۔ بیٹے کا جلوس بھی تو نہ دیکھ سکے ـــ

دوسرے دن پوسٹ مارٹم کے بعد پولس کے پہرے کے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے لاش گھر لائی گئی ـــ پتھر کے کلیجے پانی پانی ہو گئے ـــ وہ ہر دل عزیز یاروں کا یار ـــ آخری سفر پر جا رہا تھا۔ آگ اور نفرت کی ہولی میں اس کا لہو بوند بوند کر کے اچھالا جا چکا تھا۔ اس کی جوانی اور حسن ـــ اس کے خواب ـــ ماں باپ کی تمنائیں ـــ بہنوں کی آرزوئیں سبھی کچھ نفرتوں کے الاؤ میں بھسم ہو چکے تھے۔ شاہد کا بھرا پُرا گھر خون کی اس ہولی میں جلا تھا ـــ اس کا گناہ کیا تھا؟

سب کی ڈری سہمی آنکھوں میں ایک ہی سوال تھا؟

کیوں؟ ——

کیوں؟ ——

کوئی بتائے —— کہ یہ نفرتوں کا کھیل کب تک جاری رہے گا۔

کوئی بتائے کہ —— ایسے کئی شاہدوں کے گھر۔ کب تک جلائے جائیں گے؟!

—— اور کیوں؟!

OO

لال ساڑی

"شادو !۔"

"ہوں ۔"

"تو نے سنا بابا کیا بولتے تھے"؟

"نہیں ۔"

"یہ کہ محلے والے مجھے آوارہ سمجھتے ہیں!"

"محلے والے کہتے ہیں نا، بابو تو نہیں کہتے!" شادو کی آواز میں بھولا پن تھا۔

"دونوں باتیں ایک ہیں شادو! کیا تو بھی — تو بھی مجھے ایسا سمجھتی ہے؟"

گل خاں کی آواز یہ پوچھتے پوچھتے بھرّا گئی۔ شادو نے بڑی بڑی آنکھوں سے اسے ایک لمحہ دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔ اُس کی آنکھوں میں نمی تھی اور ہونٹ کپکپا اُٹھے تھے۔

"سچ شادو! کیا تو مجھے بُرا نہیں سمجھتی؟ اللہ قسم!؟" — گل خاں کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

"سچ گل —! اللہ قسم۔"

"بس شادو۔ میرے لیے یہی کافی ہے، اب اتنا اور کہہ دے، تیرے دل میں میرا کچھ خیال بھی ہے کہ نہیں۔"

شادو کی معصوم آنکھوں میں شرم کی لالی جھلملانے لگی۔ چہرہ عرق ریزہ ہو گیا۔ سر جھک گیا —

"بول شادو! یہ جو تو ہر روز بابا کی روٹی کے ساتھ میری روٹی بھی رکھے راہ دیکھتی ہے۔
— جھکی جھکی نظروں سے میری طرف شرما کر چپ چاپ دیکھا کرتی ہے۔ یہ سب کیا ہے؟!
میں ..... میں تو تجھے دل سے چاہتا ہوں۔ صرف تجھے ایک نظر دیکھنے کے لیے بابا کی ریڑھی دھکیل
کر لاتا ہوں — کیا تو بھی — تو بھی مجھے چاہتی ہے۔؟"
شادو منہ چھپا کر اندر بھاگ گئی۔
اور گل چمکتی آنکھوں سے اُسے دیکھ کر ہنس دیا۔

"گل خان — میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ کوئی کام کر۔ کمائی والا بن —" بوڑھا بابا روٹی
کا نوالہ توڑتے ہوئے بولا۔
"کیا کام کروں بابا — کوئی کام دے تب نا —!" وہ نوالہ اٹھا نہ سکا۔
"ہاتھ پیر سلامت ہیں، تو کوئی لنگڑا لولا تو ہے نہیں — محنت مزدوری کر!"
"پہلے وہ بھی کی تھی نا! میں جھوٹ اور دغابازی سہہ نہیں سکتا بابا۔ اس لیے مالک نے کام سے
نکال دیا کہ میں سچ بولتا ہوں۔" گل کے حلق میں پھندا سا پڑ گیا۔ اس کا چہرہ اُتر گیا — "بچپن میں
ماں باپ نہ مرتے — تو — تو میں بے سہارا نہ ہوتا — پڑھا لکھا بھی نہیں۔ پیسہ پاس نہیں۔
کیا دھندا کروں؟
شادو کوٹھری کے دروازے سے لگی کھڑی اپنے پلو سے آنسو پونچھ رہی تھی۔
"تیری روٹی مجھے بھاری نہیں بیٹا — مگر — مگر کیا کروں، گلی محلے والے طعن کرتے ہیں کہ
تو — تو میرا کون ہے؟! —" بوڑھا اٹک اٹک کر دل کی بات اُگل بیٹھا — گل کھانا چھوڑ
کر اُٹھ گیا —

شادو کا بوڑھا بابا دن بھر گلی گلی گھوم کر پھل بیچا کرتا تھا۔ یہی اس کا دھندا تھا اور گل خان

بوڑھے بابا کے ساتھ رہتا اور اس کی ریڑھی دھکیل کر لاتا۔ لے جاتا اور بابا کے ساتھ
بچیں بھی بیچ لیتا۔ مگر اس کا اپنا کوئی کام دھندہ نہ تھا۔ وہ خود بے کار ہی رہتا۔ کبھی کبھی کہیں
مزدوری کر لیتا تو کچھ روپے بابا کو لاکر دے دیتا۔ مگر بابا کو اس کی کاہلی اور بیکاری اچھی نہ لگتی
تھی، وہ چاہتا تھا کہ گل کسی کام سے لگ جائے، کسی قابل بن جائے۔ تو کسی دن اپنی شادو کے
ہاتھ پیلے کردے۔ بابا کو کتنا ارمان تھا شادو کے بیاہ کا۔ کوئی اور لڑکا اس کی نظر میں نہیں تھا۔
سب ایسے ویسے پورا اُچکے، شرابی اور جواری لگتے۔ بس گل خاں ہی اس کی نظر میں جچتا تھا۔ خوبصورت
دراز قامت، میٹھے میٹھے بول بولنے والا۔ کھری کھری سنانے والا ـــ لیکن محلے والے گل کے
دشمن تھے۔ وہ کبھی ان کا ساتھ نہ دیتا تھا۔ شراب پیتا نہ جوا کھیلتا، نہ ڈاکہ ڈالتا۔ انھیں گل کی
یہ پارسائی ذرا نہ بھاتی۔ وہ اسی لیے اس کے پیچھے پڑ گئے تھے کہ کسی طرح بوڑھا اس کے خلاف
ہو جائے اور گھر میں بیٹھی ہوئی خوب صورت شادو پر ان میں سے کسی کا قبضہ ہو جائے۔ گل کے ہوتے
کسی کی مجال نہ تھی کہ ادھر جھانک سکے۔

"شادو بیٹی! آج میلے میں چلے گی کیا؟" بابا بیڑی سلگاتے ہوئے بولا۔
"نہیں بابا! کس کے ساتھ جاؤں؟" وہ بستر لگا رہی تھی۔
"چلی جا کسی سہیلی کے ساتھ۔"
"سب جا چکی ہوں گی۔ میں جا کر بھی کروں گی کیا ـــ؟"
بابا کچھ دیر تک بیٹی کو تکتا رہا۔ دل میں پیار امنڈ پڑا ـــ یہ بن ماں کی بچی ـــ دل میں کتنے
ارمان ہوں گے۔ ماں ہوتی تو کہتی۔ ضد کرتی۔ مجھ سے ہمیشہ چھپاتی ہے۔ غریب کو میں نہ چاہوں تو کون
چاہے، کتنی دکھی ہے میری بچی۔
"بیٹی! تو دکھی نہ ہو۔ گل کے ساتھ تھوڑی دیر گھوم آ ـــ یہ لے، یہ کچھ روپے ہیں، اپنے لیے
کوئی چیز لیتی آنا۔"
"بابا! تم کتنے اچھے ہو ـــ" وہ بابا کے سینے سے لگ گئی۔

وہ سر پر آنچل بار بار جما رہی تھی۔ گل کی اوٹ میں ڈر ڈر کر قدم اٹھا رہی تھی۔ اس کا دل ہولے

"ذلیل، کمینے! کیا اسی لیے میں نے اپنی بیٹی کو تیرے ساتھ بھیجا تھا کہ تو اُسے لے کر میلے میں ناچے گائے۔؟"

"یہ جھوٹ ہے بابا! کس نے بتایا ہے تمہیں؟" وہ دنگ رہ گیا۔

"سارے محلے والوں نے دیکھا ہے گل! تو کس کس کا منہ بند کرے گا۔ میں نے بے سہارا جان کر تجھے سہارا دیا۔ اپنا بیٹا سمجھا اور آج تو نے میری عزت اُچھالی ہے۔" بوڑھا غصّے سے ہانپ رہا تھا۔

"نہیں نہیں بابا ـــ یہ جھوٹ ہے۔ ان لوگوں نے دشمنی سے یہ بدنامی اٹھائی ہے۔ اللہ قسم ـــ شادو سے پوچھ لو ـــ"

"شادو کی مجال نہیں کہ منہ پر جواب دے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کر بیٹھوں تو ـــ یہاں سے چلا جا ـــ چلا جا ـــ اپنی صورت پھر نہ دکھانا۔ تو آوارہ ہے، کمینہ ہے۔"

"بابا مجھے آوارہ نہ کہو۔ میں بھی شریف ماں باپ کی اولاد ہوں، غریب ہوں تو کیا؟ عزت مجھے بھی پیاری ہے۔" گل کو طیش آ گیا۔

"بڑا آیا عزت والا بن کر ـــ جا جا!" بابا اپنی لاٹھی اُٹھا کر آگے بڑھا۔ وہ بھڑک اٹھا تھا۔ شادو دوڑ کر آ گئی۔

"بابا، میرے اچھے بابا! گل چلا جائے گا۔ اس پر ہاتھ نہ اُٹھاؤ بابا۔ لوگوں نے تمہیں بہکا دیا ہے بابا۔" وہ رونے لگی۔

"تیری یہ مجال۔" بوڑھے نے بیٹی پر لاٹھی اٹھا دی۔ گل بیچ میں آ گیا۔

"چھوڑ دو، چھوڑ دو۔ یہ لاٹھی ـــ تم غصّے میں پاگل ہو رہے ہو۔"

"نہیں ـ!! ـــ اور شادو دُور جا گری۔ گل نے اُسے دھکیل دیا۔ اور اُس کی چیخ نکل گئی۔

گل کے سر پہ چوٹ آ گئی تھی۔ سارا چہرہ خون میں لت پت ہو رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ حسرت بھری نظروں سے شادو کو دیکھا اور یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا ـــ

"یاد رکھنا بابا! پچھتاؤ گے کسی دن۔ یہ لوگ تمہارے دشمن ہیں — میں بھی بدلہ لوں گا
— بدلہ لوں گا۔"
"نہیں نہیں گل —" اور دور تک شادو کی سہمی سہمی سسکیاں اُسے سنائی دیتی رہیں۔

زمانہ تیز رفتاری سے بہت آگے بڑھ آیا ہے۔ بوڑھا بابا اپنی زندگی کی آخری منزلیں طے کر رہا ہے، اور شادو وہ الھڑ سی شادو نہیں رہی۔ اس نے سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ اس کے چہرے کی رونق جانے کہاں گم ہوگئی۔ آنکھوں کے ستارے بجھے بجھے سے ہیں اور اس کی سیاہ زلفوں میں چاندی کے تار چمکنے لگے ہیں۔ وہ وقت سے پہلے ہی جوانی کو پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ گل کے جانے کے بعد محلّے کے دو چار غنڈوں نے چاہا کہ شادو ان کے ساتھ بیاہ دی جائے مگر بابا راضی نہ ہو سکا۔ آج شادو کے لیے ایک بھی رشتہ نہ تھا۔ بوڑھا اُٹھتے بیٹھتے بیٹی کو دیکھتا رہتا ہے، کڑھتا رہتا ہے۔"

"میری بھولی بھالی بچّی! اب تیرے لیے کوئی بر نہ آئے گا، کوئی تجھے بیاہ کر اپنے گھر نہ لے جائے گا، تیری ڈولی کبھی نہ اُٹھے گی میری بچّی! سب کے سب کمینے ہیں۔ میں کب تک اپنی سانس روکے رکھوں گا۔ ایک ہچکی کے ساتھ یہ ڈوری ٹوٹ جائے گی اور تو بے سہارا ہو جائے گی۔"
— وہ رونے لگتا ہے۔ پچھتاوا اُسے سانپ کی طرح ڈسنے لگتا ہے۔
اور شادو میلے میں دیکھی ہوئی لال گوٹے والی ساڑی کا سپنا دیکھتے دیکھتے اب مایوس ہو چکی تھی۔

"شادو! ایک سرگوشی —
"کون؟"
"پہچانا نہیں —"
"کون ہو تم؟"
"پہچان لو —" کوئی ایک دم اندھیرے سے اُجالے میں آ گیا۔
"ہائے تم — تم گل تو نہیں — گل — یہ تم ہو؟!"

[illegible]

رہا تھا۔ لال ساڑی — سہاگ کا جوڑا . . . . میری محبت آج سہاگ کا جوڑا پہن چکی — اور یہ گل — میرا دولہا — میرا شاہزادہ — !

اور شادو لڑکھڑا کر گل کے قدموں میں گر پڑی۔

" شادو — شادو ! کیا ہو گیا تجھے — بول بول نا —" گل خاں نے گھبرا کر اس کا سر گود میں رکھ لیا۔ خوشیوں کے بے پناہ ہجوم کو ایک کمزور ٹوٹا ہوا دل سہار نہ سکا، اور شادو لال ساڑی اوڑھے دلہن بنی گہری نیند سو گئی۔

شادو —!" گل کی چیخ بڑی ہسٹریائی تھی !!!

OO

[illegible]

رہا تھا۔ لال ساڑی ۔۔ سہاگ کا جوڑا۔ . . . . میری محبت آج سہاگ کا جوڑا پہن چکی ۔۔ اور یہ گل ۔۔ میرا دولہا ۔۔ میرا شاہزادہ ۔!

اور شادو لڑکھڑا کر گل کے قدموں میں گر پڑی۔

"شادو ۔۔ شادو! کیا ہوگیا تجھے ۔۔ بول بول نا ۔۔" گل خاں نے گھبرا کر اس کا سر گود میں رکھ لیا۔ خوشیوں کے بے پناہ ہجوم کو ایک کمزور ٹوٹا ہوا دل سہار نہ سکا، اور شادو لال ساڑی اوڑھے دلہن بنی گہری نیند سو گئی۔

شادو ۔۔۔!" گل کی چیخ بڑی ہسٹریائی تھی!!!

OO

پگلی

وہ مصوّر تھا.... حُسن کا پرستار، پتی پتی، بوٹے بوٹے.... غنچے غنچے میں حسن تلاش کرنے والا مصوّر.... نیلے آسمان پر بادلوں کی اوٹ میں آنکھ مچولی کھیلتے چاند.... بے کراں سمندر کی وسعتوں پر ڈولتی کشتیاں.... سر بلند سرو کہساروں پر جمی برف.... غرض کہ وہ ہر چیز میں خوبصورتی ڈھونڈتا ــــ پہروں تک خوبصورت مناظر میں کھویا رہتا۔ پھر جو برش اٹھاتا تو اپنے ہاتھ کی جنبش سے کینوس پر ان حسین نظاروں کو زندگی بخش دیتا۔

یہی اس کا مشغلہ تھا، وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ حُسن کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔ آج یہاں تو کل وہاں۔

اُس روز بھی سرِ شام وہ سرو کے جھنڈ کے پاس کینوس پر بل کھاتی ندی کی تصویر اُبھار رہا تھا کہ سامنے سے وہ آگئی، ایک بُت کی طرح خاموش، گہری گہری نظروں سے اسے تکنے لگی۔

وہ بھی سحر زدہ سا اس مکمل حُسن کو تکتا رہا۔ خوبصورتی کی اک زندہ تصویر اس کے سامنے تھی: کشادہ پیشانی، چمکیلی نیلگوں آنکھیں.... ستواں ناک، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ اور گہرے سیاہ بالوں کی لمبی لمبی چوٹیاں گلے میں جھولتی ہوئی ....

وہ کچھ دیر کے لیے کھو گیا۔ پھر چونکا،

"آپ ۔ آپ کون ہیں؟"

"میں کلثوم ہوں.... اور آپ؟" تصویر بول اٹھی،

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہوئے جواں سال مصوّر کی عریانیت سے بھرپور تصویر نے پہلا مقام لے لیا تھا، جو شائقین کو بے حد بے باکی سے دعوتِ نظارہ دے رہی تھی!!

اور مصوّر کا دل بری طرح ٹوٹ کر رہ گیا، وہ بیحد کبیدہ خاطر اور دل برداشتہ ہو گیا تھا، اور کلثوم بھی بہت غمگین تھی،

مہینوں تک اس نے ہاتھ میں برش نہیں اٹھایا، اس نے سٹوڈیو بھی بند کر دیا تھا، اس کی شہرت گھٹنے لگی تھی، اس کے کئی شاہکار گرد میں اٹے پڑے تھے کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ اس نے کلثوم کی جوانی کے جو کئی روپ دیواروں پر آویزاں کیے تھے وہ سب اتار کر اسٹوڈیو میں بند کر دیے تھے، ــــــ کلثوم اس تبدیلی پر حیران اور پریشان تھی، وہ محسوس کرنے لگی کہ اب مصوّر اس سے بے توجہی برتنے لگا ہے۔ پہلی سی والہانہ محبت نہ رہی۔ وہ خاموش خاموش اور کھویا کھویا سا رہتا نہ کلثوم سے ہنستا بولتا نہ منی کو پیار کرتا،

کلثوم نے آخر پوچھ لیا،

"کیا بات ہے آپ اتنے خاموش ہو گئے ہیں"۔

"تو کیا کروں ــ میرے نام پر تو دھبہ آ ہی گیا" وہ جھنجلا کر بولا۔

"اس میں میرا یا اس معصوم کا کیا دوش! یہ تو ہماری محبت کی نشانی ہے"

"اور اسی نشانی نے میری شہرت گھٹا دی ہے ـــ جاؤ مجھے تنگ نہ کرو"

یوں مصوّر اس سے بیزار رہنے لگا، پھر وہ سارا سارا دن جانے کہاں گزار آتا۔

کلثوم اپنی گڑیا کو سینے سے لگائے کڑھتی رہی، غم کی آگ میں جلتی رہی، اس کی زندگی کا سفینہ عین طوفان میں جا پھنسا تھا، پھنکارتی موجیں اور چکر اتا ہوا سفینہ، اب ڈوبا کہ اب ڈوبا۔ وہ آئینہ کے سامنے آ جاتی، وہی پرکشش آنکھیں وہی تاباں پیشانی اور گلگوں رخسار، ــــ اور اس کی آنکھوں میں ماضی ابھر آتا، ــــ اس کا بت بنے گھنٹوں بیٹھے رہنا اور مصوّر کا لکیریں کھینچتے ہوئے ہاتھ اور سراہتی ہوئی آنکھیں، ــــ اس کے دل سے ایک آہ نکل جاتی ـــ اسے اپنا بابا یاد آنے لگتا جو پچھلے سال اسے تنہا چھوڑ کر دنیا سے جا چکا تھا وہ اپنا تڑپتا دل کسے دکھاتی، کہاں جاتی؟!

اس کا محبوب مصوّر اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔

اداس سے دو دیے لگ رہے ہیں جو اندھیری رات میں ہوا کی زد پر جھلملا اٹھے ہوں ــــ وکاس کا غصّہ ایک پل کا جھونکا تھا۔ ریشم کی مایوس باتیں وہ کب سہار سکتا؟ فوراً اس پر جھکا اور سادے اس کی بکھری لٹیں سنوار کر بولا ــــ

"ریشم پلیز! فار گاڈ سیک ڈونٹ ہرٹ می ریشم! تم ایسی باتیں کرو گی تو میں کل سچ مچ یہاں سے چلا جاؤں گا۔ کیا تمہیں یہ احساس نہیں کہ تمہاری بیماری سے میں کتنا ٹوٹ چکا ہوں.. کتنا بکھر چکا ہوں"

ریشم نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور چپکے سے اپنے سرد لبوں پر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ ریشم کی یہی ادا وکاس کو بہت پسند تھی۔ وہ جب بھی اُسے ڈانٹتا تو جیسے اپنی ہار مان کر وہ ایسی حرکت کر بیٹھتی تھی۔ اور وکاس کو اس پر بے اختیار پیار آجاتا۔! اور جب ریشم کو نیند کا غلبہ سا ہوا تو وکاس نے چپکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ لحاف ٹھیک کیا اور ہلکا سبز بیڈ لائٹ جلا کر دریچے کی طرف چلا آیا۔ اور ایک ایک کر کے سارے پردے گراتا گیا۔ حتّی کہ سرہانے والے دریچے کے پاس پہنچتے پہنچتے برفباری ہونے لگی۔ اس نے پردہ کھینچا اور ایک کونہ تھام کر باہر دیکھنے لگا۔ سفید دودھیا برف ــ آسمان سے موگرے کے پھولوں کی طرح بے آواز بکھرنے لگی ہے جیسے شام کی دلہن نے آسمان کی تھالی سے سفید سفید پھول اچھال دیے ہوں۔ دور، وادیوں میں ... کہساروں پر ..... مکانوں کی چھتوں اور راستوں پر برف ہی برف ... !! ایک سرد سی لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ اسی برف تلے کتنی یادیں دفن ہیں۔ آرزوؤں کے کتنے پیکر۔ سپنوں کے کتنے رنگ اسی برف کی تہوں میں جا سوئے ہیں۔ کبھی نہ جاگنے کے لیے!!

میرے اندر بھی تو سال بھر برفباری ہوتی ہے۔ جسے ریشم کے پیار کی گرمی بھی پگھلا نہ سکی۔ یہ میرا وجود۔ میری روح، برف کا یخ تودہ ہی تو ہے۔!! یہ جو چلتا پھرتا ہنستا بولتا وکاس ہے صرف ریشم کی خاطر زندہ ہے ورنہ وکاس تو کب کا مر چکا، کب کا برف کے تودوں میں دفن ہو چکا۔ اپنی پونم کے ساتھ ــــ اپنے پیار کے ساتھ!! ــــ

وکاس تم آخر کب تک اپنے آپ کو فریب دو گے؟ کب تک ریشم کو فریب کے حسین رنگوں سے بہلاتے رہو گے؟ .... وہ اب کچے دھاگے کے سوا اور کچھ نہیں رہ گئی ہے ایک ہی جھٹکے سے جیون کا یہ بندھن توڑ کر چل دی۔ تم کب تک اسے نہیں بتاؤ گے کہ تم نے اسے صرف پونم سمجھ کر

جھکتے ہیں ـــــ جو وکاس کے قرب اور اس کی بے پناہ محبتوں کے امین ہیں۔ لیکن ایسا نہیں کر سکی۔ یہ نہیں کہ وکاس اس سے لاپروا رہا ہو اُسے چاہتا نہ ہو۔ وہ اسے دل وجان سے عزیز رکھتا ہے۔ کوئی پل اس سے دوری گوارہ نہیں کرتا۔ پروانے کی طرح اس کے گرد منڈلاتا ہے اس کے ناز اٹھاتا ہے ـــ اس کی اسی والہانہ محبت نے ریشم کو قطرہ قطرہ زہر پلایا ہے۔ شادی کے ان چار سالوں میں ریشم روز مرتی رہی روز جیتی رہی!!

اُسے اچھی طرح یاد ہے جب پونم کی اتفاقیہ موت ہو گئی ـــــ تو وکاس کس طرح ایک لاش سا بن گیا تھا! نہ ہنستا نہ بولتا۔ نہ تصویریں بناتا۔ اسے اپنا ہوش ہی نہیں رہا تھا! گھر بھرا اور تھا ہی کون جو اس کا خیال رکھتا۔؟ بوڑھے دادا جی کو جوان پوتی کی موت نے زندہ درگور کر دیا تھا۔ وہ تو بلک بلک کر رونے تھے۔

"ہائے وکاس! میں کب سے تمہارا منتظر تھا کہ کب تم ولایت سے واپس آؤ گے اور کب پونم کا ہاتھ تمہیں سونپ دوں۔ کیا پتہ تھا کہ میری معصوم بچی مجھے یہ داغ دے جائے گی۔"

اور وکاس آنسو پینے کی کوشش کرنے لگتا تو رگیں ابھر آتیں۔ چہرہ ڈوبتے سورج کی طرح آگ کا گولہ بن جاتا۔ ریشم اندر سے ٹوٹ جایا کرتی۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ وکاس کو بہلانے کی کوشش کی۔ وہ کہتا۔ جو ایک بار ٹوٹ کر بکھر چکا ہو اُسے سمیٹنے کی کوشش نہ کرو۔ میں تمہیں کچھ بھی نہ دے سکوں گا۔ میرے دل کی تھالی سونی ہو چکی ہے۔ جو تھا' میں نے پونم کے آنچل میں ڈال دیا تھا۔"

لیکن وہ تب بھی ہار نہ مان سکی۔ اُس نے وکاس کی زندگی کو اپنی زندگی سمجھ لیا تھا۔ تب آخری وقت میں دادا جی کی خواہش پر وکاس مجبور ہو گیا کہ پونم کی جڑواں بہن ریشم کو اپنا لے۔ جو اُسی کی ہم شکل ہے۔ جیسے پونم کا دوسرا روپ۔۔ ۔دونوں میں فرق صرف قد و قامت کا تھا۔ وکاس پونم کا منگیتر تھا! پونم کی جگہ ریشم کو اپناتے ہوئے اس کی روح تک کرب کی آگ میں سلگ اٹھی تھی۔ اسے جانے کتنے عذابوں سے گزرنا پڑا تھا ـــــ شادی کے بعد بھی کئی دن تک وہ ریشم سے دور بھاگتا رہا! بہانے بنا کر اپنا زیادہ وقت باہر گزارتا۔۔ ۔اور ریشم اسے

پلکوں پر ستارے چمک اٹھے۔
"وکی! آج مجھے باہر لے چلو۔ جی بہت چاہتا ہے وہاں جانے کو!" وہ کھڑکیوں کی جانب دیکھنے لگی۔

"کہاں؟"

"وہیں! چرچ کے سامنے اس جھیل کے پاس... جہاں... پو... نم..." وہ رُک گئی۔

"نہیں۔ تم وہاں نہیں جاؤ گی۔"... وہ سہم گیا "تمہاری طبیعت بھی تو خراب ہے۔"

وہ مسکرانے لگی "تم اگر نہ لے جا سکو تو میں خود چلی جاؤں گی۔ آج دل بہت چاہ رہا ہے۔ ایک بار وہ جگہ دیکھ لوں۔" ریشم کا گلا گھٹ گیا جیسے آنسوؤں کا پھندہ پڑ گیا ہو۔ سرخ شال لپیٹے وہ چمپا کا زرد پھول لگ رہی تھی۔ آوارہ بالوں کی لٹیں چہرے پر بکھر گئی تھیں۔ وکاس کے سامنے ریشم نہیں پونم تھی!۔ پونم۔ اس کی اپنی محبت۔ وہ بہکنے لگا۔

"بولو وکی! لے چلو گے نا؟!"

وہ پونم کی کوئی بات کیسے ٹال سکتا تھا! کھوئے کھوئے انداز میں بولا "ہاں ہاں لے چلیں گے!" اور ریشم عجیب انداز میں مسکرا دی۔

اور وہ شام کو سڑک تک اُسے کار میں لے گیا۔ پھر سہارا دے کر جھیل کے کنارے جہاں ایک بڑی چٹان پڑی تھی۔ وہ وہیں تھک کر بیٹھ گئی۔ شہر سے آئی ہوئی کشتیاں جھیل کے اسی کنارے لگی تھیں۔ ریشم گرم اونی کوٹ پہنے، سرخ سکارف باندھے ہوئے تھی۔ ہاتھوں میں دستانے تھے۔ وہ چٹان پر بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھی۔ وکاس ذرا فاصلے سے کھڑا تھا۔ تبھی سرد ہوا چلنے لگی۔ وہ قریب آ گیا "چلو ریشم! واپس چلیں۔"

"ابھی نہیں۔! ابھی تو برف گرے گی۔ میرا دل کہتا ہے! میں نے کب سے برف نہیں دیکھی وکاس۔!!"

"نہیں ڈیر! چلو اب، ورنہ تمہارے مزاج بگڑ جائیں گے۔ شام گہری ہو رہی ہے"

اُس نے کہنا چاہا کہ وہ آج تک اُسے پونم سمجھ کر پیار کرتا آیا ہے۔ وہ اپنے دل کا یہ راز اگل دینا چاہتا تھا مگر ڈرتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر ایک بار اُسے کھو بیٹھے۔ تب ہی ریشم نے

کہا: "وکاس! دنیا میں کئی قسم کے مجرم ہوتے ہیں نا! چور۔ ڈاکو۔ قاتل۔ ! سب کی سزا الگ الگ ہوتی ہے نا!"

"اف یہ کیا ذکر لے بیٹھی ہو۔ چلو چلیں" وہ اُسے بانہوں سے پکڑ کر اٹھانے لگا۔ وہ بیٹھی ہی رہی "نہیں وکی! پہلے میری بات سن لو۔ مجھے کہہ لینے دو!" وکاس حیران کھڑا رہا۔ ریشم کہنے لگی۔ "تو قاتل بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں نا! ایک وہ جو پکڑے جاتے ہیں جن کی سزا موت ہے۔ جو پھانسی پر لٹکا دیے جاتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو قتل کر کے پکڑے نہیں جاتے! ـــــ زندہ رہتے ہیں مگر۔ ہر پل احساس کی جیل میں عذاب سہتے ہیں۔ ہر لمحہ پھانسی پر لٹکتے ہیں۔ ایک کرب، ایک اذیت انھیں ناگ کی طرح ڈستی رہتی ہے۔ نہ وہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں۔ میرا شمار بھی دوسری قسم کے مجرموں میں ہوتا ہے"

"کیا بک رہی ہو تم! ؟" اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ریشم کا وجود بھی کانپ رہا تھا۔ وکاس نے اُسے سہارا دے رکھا تھا۔

وہ پھر مسکرائی "ہاں وکی! آج بک لینے دو۔ پھر یہ کہانی ختم ہو جائے گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جرم کی یہ داستان سنانے سے پہلے ہونٹ بند ہو جائیں۔ میں قاتل ہوں وکی!" وہ آہستہ آہستہ رُک رُک کر بول اٹھی "میں ــــ قاتل ہوں ــــ"

"قاتل؟ ــ کس کی قاتل ــ ؟!" وہ چونکا

"تمھاری ــ اپنی ــ اور ــ اور پونم کی"

"نہیں نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم پاگل ہو گئی ہو ــ نہیں!"

شام ڈھل گئی ہے۔ رات کی سیاہ ناگن نے اپنا پھن پھیلا دیا ہے۔ ایک خوفناک سناٹا ہے۔ جھیل سنسان پڑی ہے۔ اور دور سے کسی آنے والی لانچ کے چراغ ٹمٹما رہے ہیں۔

"یہ سب یوں ہوا وکاس کہ ــ تم میری بہن کے منگیتر تھے! تم اس سے پیار بھی کرتے تھے۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے جیتے تھے۔ تم جب بھی گھر آتے میں تمھیں حسرت سے تکا کرتی تمھاری جاذب شخصیت ــ تمھارا دراز و مضبوط سراپا۔ تمھارا چلنے کا انداز۔ بولنے کا انداز۔ مجھے بہت پسند تھا! اتنا کہ میں تم سے پیار کرنے لگی۔ پونم میری بہن تھی۔ لیکن اب وہ میری رقیب بھی تھی" وہ

کہتے کہتے رک گئی۔ سردی اور جذبات کی ملی جلی شدت سے اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔ اور وکاس جیسے پتھر کا مجسمہ بن گیا تھا۔ صرف اس کی سماعت باقی تھی۔ ریشم کی آواز جیسے دور کسی گنبد سے گونجنے لگی۔

"میں چاہتی تھی کہ تم میری طرف متوجہ ہو جاؤ۔ مگر تم نے کبھی میری جانب ایسی نظروں سے نہ دیکھا جن کی میں متلاشی تھی۔ میرے پیار میں روز بروز شدت آتی گئی۔ میں کسی بھی صورت تمہیں پانا چاہتی تھی۔ کسی دوسرے مرد کا تصور بھی میرے لیے بار تھا۔ میں اپنے آپ تمہارے پیار میں ڈوبتی چلی گئی۔ پونم کو میرے جذبات کا علم نہیں تھا۔ تمہیں بھی نہیں تھا۔" اس کی آواز بھر آگئی وہ رکی اور ہانپنے لگی۔ جیسے اتنا کہہ کر بہت تھک گئی ہو۔ جیسے بہت بڑا کام کیا ہو۔ موسم اچانک بدل گیا۔ ہوا کے جھکڑ چلنے لگے ہیں۔ برف گرنے کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ مگر دونوں موسم سے بے خبر اپنی اپنی آگ میں جل رہے تھے۔ وکاس ہر احساس سے عاری بت کی طرح کھڑا تھا۔ ریشم اس کا سہارا لیے بیٹھی رہی۔ اُس نے پھر سنبھل کر کہنا شروع کیا۔

"پھر تم۔ اپنی تصویروں کی نمائش کے لیے لندن چلے گئے۔ تین مہینوں بعد اچانک تمہارے بمبئی پہنچنے کی خبر ملی تو میں خوشی سے دیوانی ہو اٹھی۔ اُس روز پونم اپنی کسی دوست سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ وہ کہہ گئی کہ تمہاری کوئی کال آئے تو میں ریسیو کر لوں۔ وہ تمہاری منتظر تھی! پھر تمہاری کال آئی تم نے کہا کہ تم دوسری شام یہاں پہنچ رہے ہو۔ اور جب پونم واپس آئی تو میں نے بتایا کہ تم آج رات دس گیارہ بجے تک پہنچ رہے ہو۔ اور یہ کہ تم نے اُسے جھیل پر انتظار کرنے کو کہا ہے۔ اور۔ وہ پاگل لڑکی فوراً تمہیں لینے یہاں آگئی۔ اُس شام بھی آندھی کا سماں تھا۔ برف گر رہی تھی۔ اور رات بھر اتنی برف گری کہ سب کچھ ڈھک گیا۔ پونم گھر نہیں لوٹی۔ اتم —— تم دوسری شام گھر آگئے۔ پونم کو پوچھا تو میں نے بتا دیا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ تمہارے پروگرام کے باوجود تفریح کے لیے چلی گئی ہے۔ تم انتظار کرتے رہے۔ دادا جی بھی اُسے پوچھتے رہے۔ اور۔ اور تیسرے دن برف کی کھدائی کے بعد اس کی سردا کڑی ہوئی لاش ملی تھی۔ اسی جھیل کے پاس!۔ میں نے اپنی غرض کے لیے اُسے مار دیا! وکاس! میں اس کی قاتل ہوں۔ مجھے سزا دو۔ مجھے سزا دو۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

طوفان کے جھکڑ زور و شور سے چلنے لگے۔ جھیل ایک سیاہ ناگ کی طرح پھنکارنے لگی۔

کالی اور خوفناک رات اپنی سیاہ چادر پھیلا رہی تھی۔ اندھیرا۔۔ برف۔ طوفان۔ "نہیں! یہ
وکاس کی آواز دور تک سناٹے کا کلیجہ چیرتی ہوئی چلی گئی۔ یہ نہیں! یہ جھوٹ ہے کہ میری پونم میرے
انتظار میں کھڑی کھڑی برف کے تودوں میں چھپ گئی۔ تم نے۔۔ تم نے اُسے مارا۔ تم نے اُسے
قتل کیا ہے۔ نہیں ریشم۔ کہہ دو کہ یہ جھوٹ ہے۔ کہانی ہے۔ ریشم! میں نے تمہیں پونم کا دوسرا
روپ سمجھ کر پیار کیا۔ پوجا کی اس لیے کہ پونم کی آتما خوش ہو سکے۔ مگر تم۔ تم نے میرے اعتماد کی
دھجیاں اُڑا دیں تم نے اس گھر میں آگ لگا دی جو ہم نے تنکے تنکے جوڑ کر بنایا تھا! نہیں۔ نہیں
ریشم۔ یہ سچ نہیں ہے"

"یہ سچ ہے وکی! تم۔ تم مجھ سے نفرت کرتے۔ تو اچھا تھا۔ مجھ پر شک کرتے۔ مجھے سزا
دیتے، تو مجھے سکون مل جاتا! تم نے یہ سب کچھ نہ کیا۔ صرف پیار کرتے رہے۔ مجھے۔۔ م۔ مجھے۔
معاف مت۔ کرنا۔ وکی۔ کبھی معاف مت کرنا!" اور وہ اس کی بانہوں میں جھول گئی۔

"ریشم!"۔ وہ اس کے بے جان جسم سے لپٹ کر پھوٹ پڑا

دوسری صبح لوگوں نے دیکھا کہ دو جسم ایک دوسرے کی بانہوں میں برف کے پھولوں
میں ڈھکے پڑے ہیں!!۔

OO

11,202

ہماری کچھ اہم مطبوعات

فون نمبر ۲۶۸۸۴۹

ماڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

تنقید و تحقیق

پریم چند کچھ نئے مباحث		مالک تالا	10/-
کرشن چندر اور مختصر افسانہ نگاری		ڈاکٹر احمد حسن	60/-
اقبال کے تصورات عشق و خرد		ڈاکٹر وزیر آغا	100/-
غزل کے نئے جہات		پروفیسر سید محمد عقیل	70/-
خوشبو کا سفر، سفرنامہ پاکستان		ڈاکٹر کیول دھیر	60/-
عرشی صاحب کے خطوط	مرتب	ڈاکٹر زکیہ جیلانی	80/-
انیس شخصیت اور فن		ڈاکٹر فضل امام	60/-
شاعر اخترالزماں جوش ملیح آبادی		ڈاکٹر فضل امام	30/-
میراجی شخصیت اور فن	مرتب	کمار پاشی	40/-
ن۔ م۔ راشد شخصیت اور فن		شہریار، مغنی تبسم	40/-
گوپال متل شخصیت اور فن		کمار پاشی	50/-
حرف راز۔ اقبال کا مطالعہ		پروفیسر حامدی کاشمیری	25/-
ڈاکٹر مظفر حنفی حیات شخصیت اور کارنامے		ڈاکٹر محبوب راہی	125/-
سات سمندر کا شاعر	مرتب	ساحر شیوی	30/-
خلیل کا مکان		آدم نصرت	40/-
کوکن کا عشق	ترتیب	پرویز یا علی	30/-
تنقیدی ابعاد		ڈاکٹر مظفر حنفی	70/-
اردو کہانیوں میں ادوار کے سماجی و لسانی پہلو		ڈاکٹر یونس اگاسکر	
اردو ناول اور تقسیم ہند		عقیل احمد	40/-
نئی تحریریں		ڈاکٹر فنا شادانی	50/-
تخلیق و تنقید		ڈاکٹر یحییٰ نشیط	40/-
جدید ادب	مرتب	مخمور سعیدی	30/-
عزیز احمد کی ناول نگاری		سلیمان اطہر جاوید	50/-
طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ		خواجہ عبدالغفور	50/-
اردو شاعری میں اشاریت		سلیمان اطہر جاوید	45/-
اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت و ارتقا		ڈاکٹر روشن اختر کاظمی	50/-
ادب کی پرکھ		ڈاکٹر نریش	50/-
تنقید اور عملی تنقید		ڈاکٹر وزیر آغا	24/-
تحریک اسلوب جبل پور	مدیر	گوپال متل	35/-
لاہور کا جو ذکر کیا		گوپال متل	25/-
تلاش و تعبیر		ڈاکٹر منظر اعظمی	36/-
اے بیابانے لوگو		وارث علوی	40/-
میرے خیال میں		پروفیسر نظیر صدیقی	38/-
مضامین ڈاکٹر عبدالودود	مرتبہ	صبیحہ ودود	30/-
نکات النسا		وحیدہ نسیم	30/-

ناول افسانے ڈرامے

کھلا		جوگندر پال	50/-
فدا		صالحہ عابد حسین	50/-
پاگل خانہ		حجاب امتیاز علی	60/-
کتابوں کے ...		شرف کمالی	50/-
پاکستان ایکسپریس		خشونت سنگھ	30/-
پلس اٹی نس		آمنہ ابوالحسن	40/-
پرواز		رشید قاضی	40/-
حرف حرف داستان		عظیم اقبال	40/-
بیریوں والا فقیر		کشمیری لال ذاکر	25/-
بے چین لمحوں کا تنہا سفر		وریندر پٹواری	40/-
اندھے رشتے (ڈرامے)		انیل ٹھکر	40/-
دستاویز، سعادت حسن منٹو	مرتبہ	بلراج مین را	45/-
اتفاق		ڈاکٹر نریش	30/-
درد کا رشتہ		ڈاکٹر نریش	35/-
[illegible]		شیخ اسماعیل	30/-
اپنے مرکز کی طرف		اوم کرشن راحت	35/-
ساحل سمندر اور سیپ		ہرانند سوز	35/-
قدم قدم دوزخ		محمد بشیر مالیر کوٹلوی	35/-
بادل چھٹ گئے		محمود بشیر	50/-

شاعری

کڑی دھوپ		ساحر شیوی	40/-
انتخاب کلیات جوش	مرتب	ڈاکٹر فضل امام	60/-
سچے بول		گوپال متل	30/-
بانکپن احساس کا		کرشن موہن	40/-
فرمودات		جنید الماس	40/-
بہوترنگ		اوم کرشن راحت	40/-
شہر میں ایک تحریر		بلراج کومل	40/-
شوق کی جیت کی لعنت		قمر واحدی	30/-
آج برف زاروں کی		شباب للت	40/-
شام و سحر		مغل اقبال اختر	30/-
تعارف		سلطنت جہانی	40/-
معراج ثانی		شجاع خاور	50/-
سبزہ و بازہ ...		بدیع عثمان سحر	40/-
شرار نغمہ		گوپال متل	25/-
گل خودرو		شائستہ یوسف	30/-
زلال کاش		احتشام اختر	25/-

مکمل فہرست کتب مفت طلب فرمائیں